سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۲۰۲

مقالاتِ گارساں دتاسی

حصّہ اوّل

پروفیسر موصوف کے "ہندستانی زبان" پر سالانہ لکچر

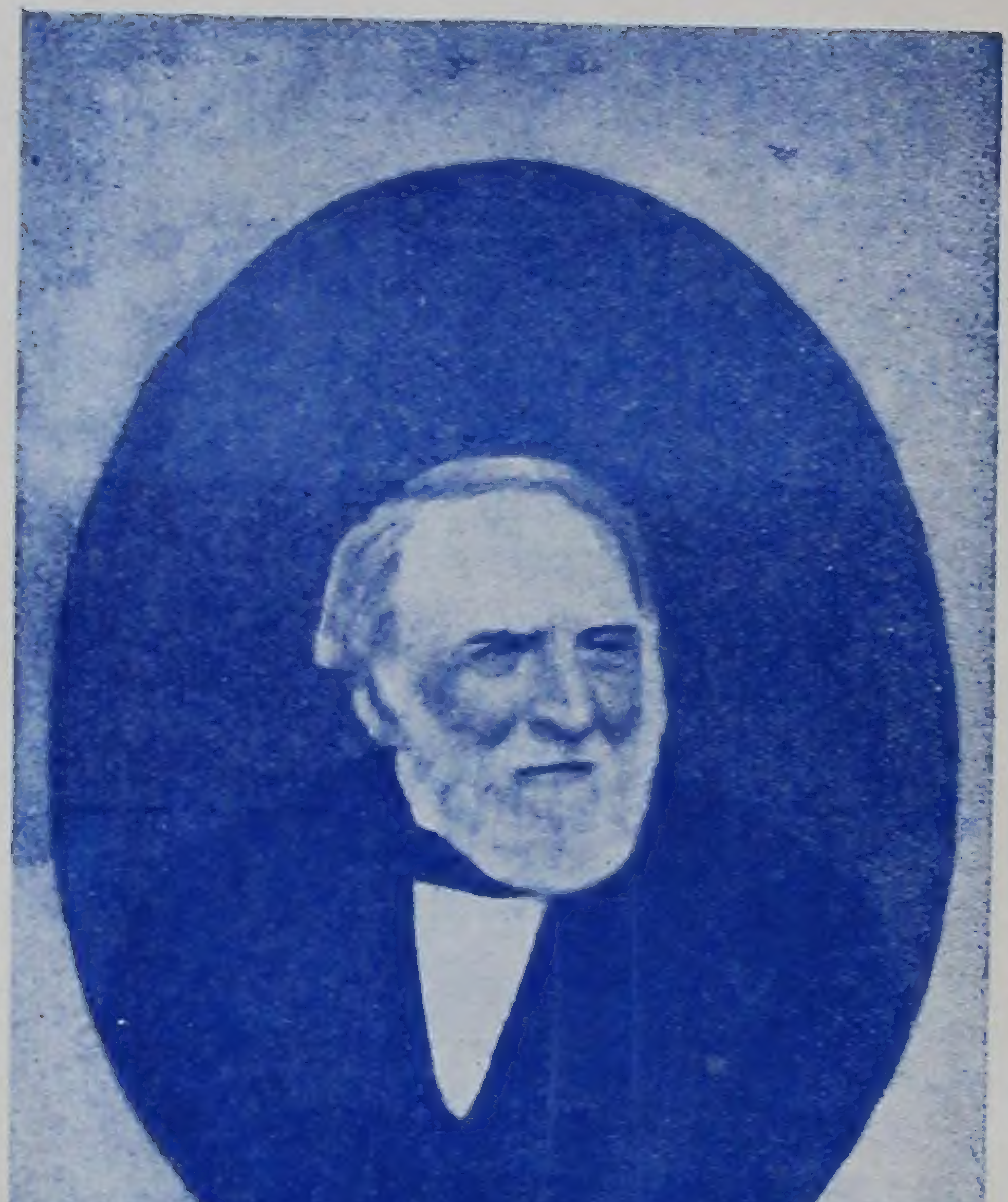
سنہ ۱۸۷۰ء سے سنہ ۱۸۷۳ء تک

شائع کردہ

انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۳ء

قیمت مجلّد ۵ر بلا جلد للعہ



موسیو گارسان دتاسی

فہرستِ مضامین مقالاتِ گارساں دتاسی

حصۂ اوّل

شمارہ	مضمون	مترجم	صفحہ
۱	مقالہ سنہ ۱۸۷۰ء	ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)	۱
۲	مقالہ سنہ ۱۸۷۱ء	"	۵۶
۳	مقالہ سنہ ۱۸۷۲ء	"	۱۵۹
۴	مقالہ سنہ ۱۸۷۳ء	پروفیسر عزیز احمد صاحب عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد (دکن)	۲۹۸

ہندستانی زبان وادب ۱۸۷۰ء میں

گزشتہ سال کے نصفِ آخر میں فرانس (جرمنی کے خلاف) تباہ کُن جنگ میں مبتلا رہا جس کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ میں میقاتِ مقررہ پر اسباقِ ہندستانی کا افتتاحیہ خطبہ پڑھ سکوں۔ چناں چہ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کے لیے جو ہندستان کی ادبی و معاشری تحریک کے ساتھ لگاؤ رکھتے ہیں ایک دوسرے ذریعے سے دل چسپی کا سامان مہیّا کروں۔ واضح رہے کہ ۱۸۷۰ء میں ہندستان میں جو ادبی اور معاشری تحریک جاری رہی ہے اور اس کا جو اظہار ہندستانی زبان کے ذریعے سے ہوا ہے، میں اس کا اس وقت جائزہ لیتا ہوں۔

دہلی کالج کو جس کا نام "دارالعلوم" ہے اس قدر کامیابی نہیں نصیب ہوئی جتنی کہ مسلمانوں کو توقع تھی۔ ۱۸۶۹ء کے آخر میں اس کالج کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ پہلے معتمد نے اپنی سالانہ رپوٹ پڑھی جو زیادہ اطمینان بخش نہیں تھی۔ اس کے بعد مولوی سیّد محمد علی نے جو خاص طور پر اس جلسے میں شرکت کے لیے مرزا پور سے آئے تھے، ایک نہایت پُرجوش تقریر کی جس میں انھوں نے مسلمانوں کی اپنے علومِ دینی اور مذہبی زبان کی طرف سے بے توجہی کی جانب اشارہ کیا۔ موصوف نے مسلمانوں کو اپنی حالت بہتر کرنے کے متعلق نہایت دل نشین اور مؤثر

الفاظ میں توجہ دلائی۔ اس تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ بعضوں کے آنسو نکل آئے اور بعض دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ اودھ اخبار نے ۸ کالموں میں اس تقریر کو نقل کیا ہے۔ مقرر نے خاص کر اس موضوع پر زور دیا ہے کہ وہ سائنس جو مذہب پر مبنی ہو دنیا میں سب کچھ کر سکتی ہے لیکن اگر ایسا نہیں تو وہ محض بے کار ہے۔ یہ تقریر اس قدر طویل ہے کہ میں پوری اس جگہ نہیں نقل کر سکتا۔ ہاں اس کے ابتدائی حصّے کے چند جملے یہاں نقل کرتا ہوں:

"مسلمانو! بارہ سو برس گزرے کہ اللہ تعالیٰ نے علمِ دین کی شمع عرب میں روشن کی، جس کی روشنی سے ساری دنیا منوّر ہو گئی۔ آٹھ سو سال کا عرصہ ہوا کہ اس دین کی شعاعیں ہندُستان کی سرزمین پر پہنچیں اور اس ملک کے ہر گوشے میں اُجالا ہو گیا۔ اسی شہر دہلی سے دینِ اسلام کی روشنی سارے ملک میں پھیلی۔ اس لیے کہ جب مسلمان فرماں رواؤں نے ہندُستان کو فتح کیا تو انھوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اس کی ترقی و فلاح کی کوشش کی۔ انھوں نے عرب و ایران کے مشہور علما و فضلا کو دعوت دے کر بلایا اور یہیں انھیں آباد کیا غرض کہ یہ شہر علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ ہندُستان کے کسی دُوسرے شہر کو دنیا میں وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو شہر دہلی نے حاصل کی اور نہ کہیں علم و فن کی وہ ترقی ہوئی جو اس شہر میں ہوئی۔ مسلمانو! تمھیں یاد ہے کہ نہیں کہ یہ تمھارے اجداد ہی تھے جنھوں نے اہلِ ہند کو علوم سکھائے اور

ان کے امام بنے۔ مجھے خوف ہو کہ کہیں اب تمھارے متعلق یہ
نہ کہا جائے کہ تم میں اتنی صلاحیت بھی نہیں کہ اپنے بزرگوں
کی علمی تصانیف کو پڑھ سکو اور ان تواریخ کو سمجھ سکو جن میں
ان کی فتح مندیوں اور کشور کشائیوں کے وقائع درج ہیں"![1]

سیّد موصوف نے مسلمانوں کی پستی اور ان کی بُرائیوں کا جو ذکر کیا ہو اس سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہو کہ مسلمانوں میں اس وقت بیداری کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ وہ پھر سے اپنے علوم و فنون کو زندہ کرنے کے متمنی ہیں۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہو کہ ان میں اپنے مذہب کے متعلق قدیم کتب کے شائع کرنے کا شوق بڑھ رہا ہو۔ چناں چہ تفسیر و حدیث کی کتب مثلاً بیضاوی اور بخاری وغیرہ کے ایڈیشن خوب فروخت ہو رہے ہیں۔

کلکتے کے مسلمانوں کی ادبی انجمن کے معتمد مولوی عبداللطیف بہادر ہیں جو مستقل معتمد معلوم ہوتے ہیں۔ یہ انجمن خوب ترقی کر رہی ہو۔ اس قسم کی ادبی انجمنیں ہر بڑے شہر میں قائم ہو رہی ہیں۔ علی گڑھ اخبار کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ مغل سرائے کی انجمن خاص جوش و انہماک کے ساتھ کارگزار ہو۔ اس انجمن کے پچھلے جلسے میں بابو ابکا چون چٹرجی نے "انسان اور اس کے فرائض" پر ایک نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی[2]۔ اس کے علاوہ بابو دینا ناتھ گنگولی نے ایک نہایت دل چسپ تقریر فرمائی جس میں انھوں نے ہندوؤں کے مشہور تیرتھ ہردوار کے سفر کے کوائف

---

[1] یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا ہو۔ (مترجم)

[2] علی گڑھ اخبار ۶ مارچ ۱۸۶۹ء میں ۶ کالموں میں یہ تقریر نقل کی گئی ہو۔

بیان کیے[۱]۔ یہ انجمن ہندستانی زبان کے ذریعے اہلِ ہند کی تعلیم کے لیے بھی خاص طور پر کوشاں ہی اور اس ضمن میں متعدد اہم تجاویز منظور کی گئی ہیں۔ یہ انجمن عقدِ بیوگان کے متعلق بھی پرچار کر رہی ہی۔ پچھلے زمانے میں ہندستان میں بیوہ عورتوں کو عقدِ ثانی کی اجازت نھی۔ جس طرح یہودیوں میں ہی کہ شوہر کے مرجانے پر بیوہ عورت شوہر کے بھائی کے ساتھ نکاح کرلیتی ہی اسی طرح ہندوؤں کی بیچ اقوام میں بھی یہ دستور پایا جاتا ہی۔ گزشتہ زمانے کے رسم ورواج چاہے کچھ بھی کیوں نہ رہے ہوں اب اس وقت انجمن کی جانب سے ہندی میں پنڈتوں کے لیے ایک اپیل شایع ہوئی ہی تاکہ ان کی قطعی راے معلوم کی جائے۔

دہلی کی ادبی مجلس کی جانب سے اس کے جلسوں کی کارروائی اُردو میں رسالے کی صورت میں اکمل المطابع سے شایع ہوتی ہی۔ اس رسالے کے سرورق پر ایک شعر لکھا ہوتا ہی جس کا مطلب یہ ہی "فلسفہ وخطابت کی ترقی کے لیے اس انجمن کے جلسے منعقد ہوتے ہیں جن کا ذکر ان اوراق میں مندرج ہی۔"

بہار کی مجلسِ علمی (سائنٹفک سوسائٹی) کا مرکز مظفر پور ہی۔ اس انجمن کے ارکان بیش تر مسلمان ہیں اور اس کا مقصد یہ ہی کہ مسلمانوں کے عامۃ النّاس کی اخلاقی وذہنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے اور ان کے لیے اسباق کے ذریعے تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ انجمن نے ایک یہ تجویز بھی منظور کی ہی کہ مغربی تصانیف کے ہندستانی میں ترجمے کرائے جائیں۔

---

[۱] علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۲ نومبر ۱۸۶۷ء

انجمن ایک رسالہ بھی شایع کرتی ہی، انجمن کے ارکان کا ارادہ ہی کہ اس کے لیے ایک عمارت بنوائی جائے، ایک بڑا کالج قائم کیا جائے اور غربا کے لیے زراعت و حرفت کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے۔ اس وقت انجمن کے پانچ مدارس چل رہے ہیں جن میں بلا امتیازِ مذہب ہندو اور مسلمان شریک کیے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہی کہ ہندستانی لوگوں کو غیر مذہب والوں کے ساتھ اپنے بچّوں کو تعلیم دلانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا جس طرح کہ فرانس اور آئرلینڈ میں بعض لوگوں کو ہوتا ہی جو دوسرے عقائد والوں سے بالکل علاحدہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان مدارس میں ایک مدرسے نے خاص طور پر ترقی کی ہی۔ یہاں اُردو کے ذریعے سے مغربی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور طلبا کو اپنی مذہبی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی ہی۔ چناں چہ ایک پنڈت سنسکرت کی تعلیم کے لیے اور مولوی عربی کے لیے مقرر ہی۔[1]

بندھیل کھنڈ کے ضلع باندہ میں تعلیم یافتہ ہندستانیوں نے ایک ادبی مجلس قائم کی ہی جس کے جلسے ہفتے کے دن شام میں منعقد ہوا کرتے ہیں۔ بابو پورنا چند اس مجلس کے صدر ہیں اور بابو گنگا دھر مکرجی معتمد ہیں۔[2]

مسٹر ڈیگٹن نے آگرے میں ایک انجمن قائم کرنے میں کام یابی حاصل کی ہی۔ اس انجمن کے قواعد و ضوابط مرتّب ہو چکے ہیں اور اس کے

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ یکم جولائی و ۵ اگست ۱۸۶۹ء میں یہ لکچر پورا شایع ہوا ہی۔

[2] اخبارِ عالم مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۸۶۹ء مطبوعہ میرٹھ۔

عہدے دار بھی مقرر کیے جا چکے ہیں[1]۔

مہندر لال رئیس کلکتے کی تجویز کے مطابق ایک جدید انجمن کی بنا ڈالی گئی ہی۔ اس انجمن کے قیام سے اہلِ ہند کی توجہ اس کی جانب منعطف ہوگئی ہی اور توقع ہی کہ یہ انجمن خوب کام یابی حاصل کرے گی جس کی کہ وہ مستحق ہی[2]۔

بنارس کے ان نوجوانوں نے جو اپنی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد بھی علم سے اپنا تعلق برقرار رکھنا چاہتے ہیں ایک ادبی مجلس قائم کی ہی جس کا نام "انجمن نوجوانانِ بنارس" ہی۔ اس میں شہر 'بنارس' کے منتخب نوجوان شریک ہیں۔ اس انجمن کا مقصد عام اصلاح ہی۔ پچھلے اپریل کی ۱۶ر کو اس انجمن کی دوسری سال گرہ منائی گئی۔ اس موقع پر بابو شیو پرشاد نے اُردو میں ایک تقریر کی اور یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ایک ماہ نامہ یا سہ ماہی رسالے کا اجرا کیا جائے جس میں صرف ارکانِ انجمن کے مضامین شایع ہوا کریں گے۔

ہمیں برہمو سماج سے جسے رام موہن رائے نے ۱۸۳۰ء میں قائم کیا تھا، اس واسطے اور بھی زیادہ دل چسپی ہی کہ اس کی ترقی دراصل ہندستان میں مسیحی مذہب کے مرادف ہی[3]۔ ۱۸۶۹ء کے

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۰ رمئی ۱۸۷۰ء

[2] علی گڑھ اخبار مورخہ ۴ رفروری ۱۸۷۰ء

[3] اس کے متعلق تفصیلی معلومات سوفیہ ڈابسن کولٹ کی کتاب "ہندت ن توحید" میں ملیں گی۔ اس کتاب کے سرورق پر بہ طور جے جی وہیٹر کے بارہ اشعار درج ہیں جن میں سے میں ایک یہاں نقل کرتا ہوں: "روح القدس کے سفید پروں کا سایہ ہر کس و ناکس کے سر پر رہتا ہو، چاہے انھیں کوئی دیکھے یا نہ دیکھے۔"

آخری ایام میں[ہ] بابو کیشب چندر سین نے جو اس وقت اس فرقے کے سرگروہ ہیں اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے لیے ایک نئے مندر کا افتتاح کیا[۱]۔ اس جلسے میں بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بھی شرکت کی[۲]۔ اب تک اس فرقے میں صرف بنگال کے تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوتے تھے لیکن اب اس کا اثر اور آگے بڑھ رہا ہے۔ گزشتہ سال اس فرقے کی سولہ عبادت گاہیں مشرقی بنگال، پنجاب بمبئی اور دکن میں قائم کی گئیں۔ دس برہمو مبلّغین نے بنگال اور شمالی ہند کے دوسرے حصّوں میں سفر کیا اور انھیں اپنے مقصد میں اچھّی خاصی کامیابی ہوئی[۳]۔ منگلور کے باشندوں نے اس جماعت کی مرکزی مجلس کو لکھا ہے کہ ہماری تعلیم و تلقین کے لیے مبلّغین کو بھیجا جائے تاکہ وہ اس اصلاحی تحریک میں شرکت کر سکیں۔

ہندوؤں میں بعض ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ برہمو سماج ایک عالم گیر مذہب کی حیثیت اختیار کرے۔ مثلاً بابو پرتاپ چندر نے گزشتہ مئی کے مہینے میں ہندستانیوں کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے تقریر کی۔ یہ تقریر جوش اور خطابت کا اعلا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس میں موصوف نے

[ہ] بابو کیشب چندر سین بچپن میں یتیم ہو گئے تھے اور کلکتے کے ایک کالج میں انھیں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ بُت پرستی سے نفرت ہو گئی اور آہستہ آہستہ غور و فکر اور عبادت سے انھوں نے خدا کی وحدت کو پہچانا۔ اس زمانے میں برہمو سماج کی انجمن وجود میں آ چکی تھی۔ انھوں نے اس میں شرکت کر لی اور کچھ عرصے بعد وہ اس انجمن کے پُرجوش حامیوں اور چلانے والوں میں ہو گئے۔ بہت دنوں تک کلکتے کے ایک مندر میں ہندستانیوں کے بڑے مجمع کے روبرو وہ وعظ و تلقین کرتے ہیں۔ آج اس انجمن کے پچاس عبادت خانے (مندر) ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کیشب چندر سین نے تعلیم کی نشر و اشاعت میں بھی بہت جد و جہد کی۔ اس کے علاوہ عورتوں کی حالت کو سدھارنے اور ذات پات کو توڑنے کا کام ان کے مقاصد میں شامل ہے اس لیے کہ یہ رسوم قبیحہ ملک کی ترقی میں رُکاوٹیں پیدا کرتی تھیں۔ برہمو سماج کی تحریک نے ہندو معاشرہ میں ہل چل ڈال دی ہے اور بالخصوص متوسط طبقے کے امرا اس تحریک سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ (عقیدہ و کلیسا۔ یکم جولائی ۱۸۷۰ء)

[۱] انڈین میل مورخہ ۱۹ جنوری ۱۸۷۰ء

[۲] انڈین میل مورخہ ۸ مارچ ۱۸۷۰ء

[۳] انڈین میل مورخہ ۹ فروری و ۶ دسمبر ۱۸۷۰ء

حاضرین کو عالم گیر مذہب کے خیال سے مانوس کرنے کی کوشش کی ہو انھوں نے کہا "اگرچہ دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں لیکن ان سبھوں میں بعض ایسے اصول ہیں جنھیں عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہو۔ جیسے خدا کی ربوبیت انسانوں کی اخوت، خدا کے آگے انسان کی اطاعت اور موت کے بعد کی زندگی وغیرہ۔ بالکل ممکن ہو کہ انھی اصولوں پر ایک عالم گیر مذہب کی بنا رکھی جائے"۔[1]

جیسا کہ آپ صاحبوں کو معلوم ہو اس قسم کا عقیدہ کوئی نئی چیز نہیں ہو۔ گزشتہ صدی کے بعض فلسفیوں نے اس کی تلقین کی۔ یہ عقیدہ اس تعلیم سے بالکل مختلف ہو جس کی حضرت مسیح نے اشاعت کی، جس سے ہمارے دلوں کو تسکین حاصل ہوتی ہو اور جس پر ہماری آیندہ نجات کا دار و مدار ہو۔ وہ حضرت مسیح جن کی ذات خدا اور انسان دونوں کا مجموعہ تھی۔ ان کی حیثیت صرف ایک مظہرِ الٰہی کی نہ تھی جیسا کہ بعضوں کا خیال ہو۔ نہ وہ حضرت موسیٰ کی طرح محض ایک نبی تھے اور نہ سقراط اور کنفوشس کے مثل تھے۔

بابو کیشب چندر سین گزشتہ فروری میں ہندستان سے انگلستان روانہ ہوئے۔ ان کے ہم راہ چھ نوجوان ہندو تھے جو یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ ان میں سے بعض قانون کی اور بعض طبابت کی تعلیم حاصل کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ ان نوجوانوں میں سے پانچ برہمن ہیں۔[2] میسور کے مہاراجا کے خاندان کے ۸ نوجوان بھی انگلستان تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ خود کیشب چندر سین کے یورپ آنے کا مقصد یہ ہو کہ وہ مسیحی مذہب کے متعلق تحقیق کریں اور اس کے اصول اور عملی زندگی میں اس کا جو تطابق کیا جاتا ہو اس کے متعلق معلومات

---

[1] مدراس ٹائمز مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۷۰ء

[2] علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۸ فروری ۱۸۷۰ء

حاصل کریں۔ موصوف انگلستان میں اہلِ ہند کے ترقی پزیر عناصر کی نمایندگی کر رہے ہیں اور اگر ضرورت ہوگی تو وہ اہلِ ہند کی ضروریات اور ان کی توقعات ملکہ کے سامنے پیش کر سکیں گے۔ انھیں ایک مرتبہ ملکہ کے یہاں شرفِ باریابی حاصل ہو چکا ہے۔ موصوف انگریزی زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ انگلستان پہنچنے کے چند روز بعد انھوں نے ریورنڈ جے مارٹینو کے کلیسا میں اور پھر (ہینوور اسکوائر) کے ہال میں تقریریں کیں۔ دونوں موقعوں پر حاضرین میں نہایت چیدہ اہلِ علم کا مجمع تھا جس نے تحسین و آفرین کے نعروں سے موصوف کے ساتھ اظہارِ عقیدت کیا۔ کیشب چندر سین نے اپنی پہلی تقریر میں خدا کے وجود کی ہمہ گیری، حضرت مسیح علیہ السّلام اور مسیحیت پر اظہارِ خیال کیا اور دوسری تقریر کا موضوع ہندستان کی اخلاقی نشاۃ ثانیہ تھا۔ ایسٹر کے روز بھی "فنسبری کے گرجا SOUTH PLACE CHAPEL میں خدا کی محبت کے موضوع پر تقریر کی۔ یہ تقریر بالکل مسیحی نقطۂ نظر سے کی گئی اور لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ تقریر کلیسائی وعظ کی حیثیت رکھتی تھی۔ دو ہفتے بعد موصوف نے الگنٹن کے کلیسا میں تقریر کی۔ یہ کلیسا موحدین کے لیے مخصوص ہے۔ گویا کہ بابو صاحب اِس موقع پر اپنے ہم مذہبوں میں موجود تھے۔ موصوف نے بعد میں بھی متعدد مقامات پر تقاریر کیں۔ اس پر جن کی مشہور عبادت گاہ میں بھی ان کی تقریر ہوئی۔ اب وہ ہندستان واپس ہو چکے ہیں اور ۱۵ اکتوبر کو بمبئی پہنچ گئے ہیں۔ بمبئی پہنچنے کے بعد اتوار کے روز کلکتہ روانہ ہونے سے قبل اپنے احباب کے اصرار پر انھوں نے ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر کا موضوع سفرِ یورپ کے تاثرات سے متعلق تھا۔ بعض باتوں میں موصوف کی رائے یورپ کے متعلق زیادہ اچھی نہیں ہے۔[1]

---

[1] یہ تقریر اور اس کے بعد کی چار تقریریں شایع ہو چکی ہیں۔

بابو کیشب چندر سین اور ان کے متبعین برہمو سماجی یہ دعوا کرتے ہیں کہ ویدوں کی تعلیم وحدت الٰہی کے عقیدے پر مبنی ہے۔ یہی حقیقی ہندو دھرم ہے جس کی طرف ہندو سماج کو لوٹ کر آنا چاہیے لیکن بعد میں جب ویدوں کی تعلیم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں تو فطرت پرستی کی تلقین کی گئی ہے اور جن رسوم کی پابندی کی گئی ہے وہ نہایت درجہ ادنا حیثیت رکھتی ہیں۔ چناں چہ اس ملک کے ایک دوسرے مشہور شخص دبندرا ناتھ ٹھکور نے صاف طور پر اس کا اعلان کر دیا کہ برہمو سماج اپنے عقائد کو ویدوں کی تعلیم پر مبنی قرار دیتے نہیں بلکہ وہ وحدت الٰہی کے عقیدے پر چاہے وہ ویدوں میں ہو یا نہ ہو، ایمان رکھتے ہیں۔

قدیم ہندو مت نے ابھی شکست تسلیم نہیں کی ہے۔ برہمو سماج کے مقابلے کے لیے "دھرم سبھا" موجود ہے جس میں پرانے خیال کے ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد شریک ہے۔ اس جماعت کے جلسے پابندی کے ساتھ کان گڑھ میں منعقد ہوا کرتے ہیں جن کی نسبت "اودھ اخبار" میں تفصیلات شایع ہوتی ہیں۔ اس جماعت کے اجلاس شروع ہونے سے قبل ارکان بھوانی درگام کے بت کے سامنے جا کر ڈنڈوت کرتے ہیں۔ بھوانی کو "شری مہی مائی جی" بھی کہتے ہیں۔ اودھ اخبار کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم خیالات کے ان ہندوؤں کی انجمن نے اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس کے جلسوں کی روداد ان ہندوؤں کے پاس بھیجی جاتی ہیں جو اس کے خیالات کے حامی ہیں۔

باوجود قدامت پسند ہندوؤں کی مساعی کے ہندستان برابر ترقی کی منزل کی طرف گام زن ہے۔ اگرچہ ذات پات کی تقسیم مٹی نہیں لیکن نیچی ذات والوں کو چند سال سے بہت سی رعایتیں حاصل ہو رہی ہیں[1]۔ پنڈتوں نے اب یہ بات تسلیم

---

[1] انڈین میل مورخہ ۱۹ اپریل ۱۸۷۰ء

کرلی ہی کہ منو کے شاستر کی رُو سے بیوہ عورتوں کا عقد ممنوع نہیں ہی۔ انھوں نے یہ بھی تسلیم کرلیا ہی کہ سمندر کا سفر کرنے سے کسی کی ذات نہیں جاتی۔ اور اب تو برہمنوں کے گوشت کھانے اور شراب پینے کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اب اس بات کا بھی احساس شروع ہو گیا ہی کہ لڑکیوں کی شادی سنِ بلوغیت سے پہلے نہ کی جائے۔ برہمنوں کو اس پر اعتراض نہیں ہوتا کہ جن مدارس میں ان کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں انھی میں نیچی ذات والوں کے بچے بھی پڑھنے آئیں کلکتے کی دھرم سبھا کا صدر آج کل ایک شدر ہی اور برہمن معتمد ہی۔ بنگال میں برہمن لوگ اس قسم کی ملازمتیں کرنے لگے ہیں جو ان کی ذات کے شایانِ شان نہیں کہی جا سکتیں۔ غرض کہ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذات پات کے امتیاز کی مذہبی نوعیت باقی نہیں رہی بلکہ وہ اب ایک سول ادارے کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہی۔

کپورتھلہ کے راجا اندھیر سنگھ جی ہندستان سے یورپ آنے کے لیے روانہ ہوتے لیکن دستِ اجل نے انھیں یہاں تک پہنچنے نہیں دیا۔ موصوف ایک نہایت عالی دماغ شخص تھے اور ان کی تعلیم ان اصولوں پر ہوئی تھی جن کے مطابق شہزادوں کی تعلیم ہونی چاہیے۔ آپ مہاراجا رنجیت سنگھ کے حریف کے پوتے تھے۔ آپ کا مقصد تھا کہ انگلستان میں اپنے قابل وزیر منھرا داس کے ساتھ چند مہینے رہیں۔ آپ کے ساتھ مشہور مستشرق عالم لنسولی اور میں ہندستانی تھے۔ موصوف ۱۵ مارچ کو بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے اور ۱۴ اپریل کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ نعش بمبئی پہنچائی گئی۔ ہندستان کے لیے راجا صاحب کی موت ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہی۔ راجا صاحب نہایت روشن خیال اور غیر متعصب تھے۔ بعضوں کا تو خیال ہی کہ راجا صاحب عیسائی ہو گئے تھے لیکن میرے خیال میں انھوں نے مسیحی تعلیم کو دل سے قبول کرلیا تھا، چاہے اس کا اظہار نہ کیا ہو۔ اس وجہ سے راجا صاحب کی یاد ہم لوگوں کو اور بھی زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔

کولھاپور کے نوجوان راجا صاحب انگلستان بخیر و عافیت پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے یہ سفر کیا۔ کولھاپور کے ایجنٹ کپتان ای۔ ڈبلو۔ واٹ نے نہایت سعی و کاوش سے راجا صاحب کو مغربی طرز کی تعلیم سے روشناس کر دیا ہے اور کپتان موصوف اس سفر میں بھی ان کے ہم راہ ہیں۔ راجا صاحب کی اس وقت صرف ۲۰ سال کی عمر ہے۔ سید عبداللہ سے مجھے معلوم ہوا کہ موصوف نہایت خوش مزاج اور قابل نوجوان ہیں۔ آپ انگریزی زبان بلا تکلف لکھ پڑھ سکتے ہیں اور گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ان اوصاف کی وجہ سے انگلستان کی اعلا سوسائٹی میں ان کی قدر ہوئی ہو گی۔ لیکن کیا بدقسمتی ہے کہ برّاعظم کے راستے سے وطن واپس ہوتے ہوئے ہونہار راجا نے بتاریخ ۳۰ نومبر ۱۸۶۹ء بمقام فلورانس انتقال کیا۔ ہندوؤں کے طریقے کے مطابق نعش کو دریائے آرنو کے کنارے نذرِ آتش کر دیا گیا اور راکھ گنگا میں ڈالنے کے لیے ہندستان لے گئے۔

خبر ہے کہ عنقریب مہاراجا الور اور بیگم صاحبہ بھوپال یورپ آنے والے ہیں۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ ثانی الذکر کا انگلستان میں گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا جائے گا۔ موصوفہ کی والدہ کی یاد ابھی وہاں لوگوں کے دلوں میں زندہ ہونی چاہیے۔[1]

آج کل ہندستانیوں کی اچھی خاصی تعداد یورپ کے سفر کی غرض سے آ رہی ہے۔ ان میں سے اکثر شہر لندن آتے ہیں جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ مہذب دنیا کا یہ مرکز ہے۔ وجاہت علی جو

---

[1] انڈین میل: مورخہ ۲۲ نومبر ۱۸۷۰ء

اخبار مرآت (اُردؤ اور ہندی) کے مدیر ہیں لندن آئے تھے۔ موصوف نے اُردؤ میں "آئینۂ لندن" کے نام سے ایک رسالہ شایع کیا ہی جس کا مقصد اپنے ہم وطنوں کی رہ بری ہی۔ یہ رسالہ ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہی اور اس میں انگلستان کے دارالحکومت کی خاص خاص عمارتوں کی تصاویر بھی ہیں۔

ہندستانی زبان کے متعلق جو جھگڑا پیدا ہوگیا ہی اُس کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا۔ دو علاحدہ علاحدہ جماعتیں قائم ہو گئی ہیں۔ ایک ہندووں کی اور دوسری مسلمانوں کی۔ مَیں نے اپنے ۱۸۶۹ء کے خطبے میں اس کی نسبت ذکر کیا تھا[1] ہندو اہلِ ادب صاف صاف کہتے ہیں کہ ان کے کاندھوں پر مسلمانوں کی حکومت کا جُوا اتنے عرصے رہا ہی کہ وہ اُردؤ کو کبھی پسند نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی ازمنۂ وسطیٰ کی بولی کو، جسے وہ ہندی کہتے ہیں، اُردؤ پر ترجیح دیتے ہیں۔ بعض ہندو لوگ اس خیال کے بھی قائل ہیں کہ اپنے موجودہ آقاؤں کی زبان یعنی انگریزی کو اختیار کر لیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ انگریزی زبان اہلِ ہند کی زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

اُردؤ اور ہندی کے قضیے نے اس قدر اہمیت اختیار کر لی ہی اور اس قدر عام ہوگیا ہی کہ اس کے متعلق نوجوانوں سے امتحانوں میں سوالات دریافت کیے جاتے ہیں۔ چناں چہ گزشتہ سال فروری میں لکھنؤ میں جو امتحان لیا گیا اس میں اس کے متعلق سوال موجود تھے۔ (ملاحظہ ہو اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ مورخہ یکم فروری ۱۸۷۰ء) وہ سوالات یہ ہیں:

---

[1] میرے خیالات کے متعلق اہلِ ہند نے اچھی رائے کا اظہار کیا ہی۔ چناں چہ میرا یہ خطبہ ہندستانی میں "علی گڑھ اخبار" میں (مع انگریزی ترجمے کے) اور لکھنؤ کے اخبار "تہذیب" میں شایع کیا گ

(۱) واضح کرو کہ اودھ کی عدالتوں میں اُردو کا (فارسی رسم الخط میں) یا ہندی کا (ناگری رسم الخط میں) استعمال مفید اور قرینِ انصاف ہوگا۔

(۲) اُردو اور ہندی کی خوبیاں اور نقائص بیان کرو۔ اسی طرح فارسی اور ناگری رسمِ خط کی خوبیاں اور نقائص بیان کرو۔ عوام النّاس کے لیے ان ہر دو زبانوں میں سے کس زبان کے استعمال میں زیادہ سہولت ہی۔

(۳) اُردو اور ہندی سے کیا مراد ہی؟ ان دونوں کا فرق واضح کرو۔

(۴) اُردو اور ہندی سے کونسی زبانیں مُراد ہیں؟ تم کن تصانیف کو اُردو کی اور کن کو ہندی کی کہوگے؟[۱]

ان سوالوں سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ امتحان کے امیدواروں کو اس مسئلے کی نسبت مستقل رائے رکھنی چاہیے۔

ہندستان کے اہلِ علم کے طبقے میں اُردو اور ہندی کی باہمی رقابت کے باعث کشاکش پیدا ہوگئی ہی۔ لکھنؤ کی "انجمن تہذیب" کے ارکان میں مولوی محمد حسین نے جو اس انجمن کے روح و رواں ہیں، اس قضیے کے متعلق موافق اور مخالف تقریروں کا خلاصہ شایع کیا ہی جو اس انجمن کے زیرِ اہتمام جلسوں میں ہوئیں۔ ہر تقریر کے بعد جو مباحثہ ہوا اس کا بھی ذکر کیا ہی۔ موصوف نے ایک ایک کرکے ہندوؤں کے ان تمام اعتراضات کا جواب دیا ہی جو اُردو کے خلاف اور ہندی کی موافقت میں کیے جاتے ہیں۔ موصوف کا یہ رسالہ جس میں ان تمام کارروائیوں کے متعلق مختصراً ذکر ہی ۳۲ صفحات پر مشتمل ہی "انجمن تہذیب" کے

---

[۱] سوالات کا ترجمہ فرانسیسی سے کیا گیا ہی۔ (مترجم)

ماہ نامے کی اور اس کی تقطیع ایک ہی ہے۔ ہر صفحے پر ۲۱ سطریں ہیں۔ یہ رسالہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:۔

"اُردو زبان اپنی وسعت حُسن اور شیرینی میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اس کے ذریعے سے قانونی، ادبی اور علمی مطالب پوری طرح ادا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ زبان سارے ملک میں استعمال ہوتی ہے۔ ہم اس کو کسی ایک صوبے سے مختص نہیں کر سکتے"۔

"علی گڑھ اخبار" مورخہ ۳ر دسمبر ۱۸۶۹ء میں اس بحث کے متعلق ایک نہایت معقول مضمون شایع ہوا ہے جس کا عنوان ہے" ہندی زبان کیا چیز ہے؟" اس مضمون کے بعض اقتباس ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

" ہندی زبان کے حامی ایک ایسی زبان چاہتے ہیں جس میں ہندستانی کے سب تصریفی قواعد حسبِ دستور برقرار رہیں۔ صرف یہ کیا جائے کہ عربی اور فارسی کے الفاظ کی جگہ سنسکرت کے لفظ ٹھونس دیے جائیں۔ دراصل یہ زبان اس وقت تک وجود میں نہیں آئی ہے اور ہمارے خیال میں اس کو وجود میں لانے کی کوشش غیر ضروری ہے۔ ہندو ادیب اپنے استعمال کے لیے ہندی زبان چاہے بنا لیں لیکن اس طرح وہ اپنے تئیں عام قومی ادب کے نشو و نما سے علاحدہ کر لیں گے اور زبان بھی بالکل علاحدہ ہو جائے گی۔ یہ دعوا کرنا کہ اس نئی زبان سے ان کاشت کاروں کو سہولت ہوگی جو انگریزی قانون کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں اور جنھیں عدالتوں میں حاضر ہونا پڑتا ہے، سراسر غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ عدالتوں کی زبان میں اصطلاحات کے استعمال کے بغیر چارہ نہیں۔ دیہاتی زبانیں اس قدر مبہم ہوتی ہیں کہ وہ ان اصطلاحات کے

مطالب پر کبھی حاوی نہیں ہوسکتیں۔ یہ عدالتی اصطلاحیں بالعموم فارسی یا عربی سے مستعار لی گئی ہیں اور عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ اب اگر ان کی جگہ دوسری اصطلاحیں وضع کی جائیں گی تو اس سے سب کو بڑی پریشانی ہوگی۔

اب ہندو شور کرنے والے یہ چاہتے ہیں کہ ان اصطلاحوں کو پس پشت پھینک دیا جائے جو ساری ہندستانی قوم میں سمجھی جاتی ہیں۔ جس حد تک کہ اس قسم کے الفاظ عام طور پر سمجھے جاسکتے ہیں وہ ان الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ رائج کرنا چاہتے ہیں جن سے موجودہ زبان بالکل ناآشنا ہے ایسا کرنے کی وہ یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ چوں کہ ہندستان میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہے اور سنسکرت ایک ہزار سال قبل ان کی زبان تھی۔ یہ بات بالکل ایسی ہے جیسے کوئی انگریز عالم یہ کہے کہ "انگریزی زبان میں سے کُل لاطینی اور فرانسیسی الفاظ خارج کر دیے جائیں اور ان کی جگہ سلیس زبان کے الفاظ رائج کر دیے جائیں"۔

اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ اُردو زبان جس زمانے میں وجود میں آئی اور اسے نشو و نما حاصل ہوئی تو معلوم ہوگا کہ اس وقت کئی صدی تک برابر اس کو مختلف رجحانات سے واسطہ رہا۔ آج اہلِ ہند میں مختلف دَور گزرنے کے بعد ایک طرح کی سول برادری پیدا ہو گئی ہے۔ متعدد شہنشاہیوں اور حکومتوں کے بعد یہ صورت اب جاکر پیدا ہوئی ہے۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرے گا کہ قدیم زمانے کے ساتھ یک لخت قطعِ تعلق نہیں کیا جا سکتا، ماضی کے ساتھ تسلسل قائم رکھنا ضروری ہے۔ دراصل جو کچھ ہے اس کو ترقی دینا ہے نہ کہ بالکل نئی بنیاد قائم کرنا، ہندو لوگ جو ہندی کو رائج کرنا چاہتے ہیں تو وہ دراصل ایک نئی اور عجیب و غریب عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔[۱]

[۱] حاشیہ صفحہ ۱۷ پر ملاحظہ کیجیے

فٹز ایڈورڈ ہال Fit N Edward Hall نے بھی، جو ایک جیّد عالم ہیں اور ہندی زبان کے حامیوں میں ہیں، اس کا اعتراف کیا ہو کہ ہندی زبان جیسی کہ وہ آج کل مستعمل ہو دراصل بالکل جدید زبان ہو۔ انیسویں صدی کے خاتمے پر جو ہندی رائج ہوگی وہ بہت مختلف ہو جائے گی۔ موصوف اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہندی میں اُردو کے جو چھوٹے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان میں ان قدیم سنسکرت الفاظ کے مقابلے میں کہیں زیادہ موسیقی پائی جاتی ہو جو بنارس میں بولے جاتے ہیں۔

اُردو اور ہندی کے قضیے کے متعلق منشی حکم چند نے جو دہلی کے ایک کالج میں پروفیسر ہیں، ایک مضمون میں اظہار خیال کیا ہو جس کا اقتباس مندرجۂ ذیل ہو[1]:

"جس طرح بچّوں کی زبان اُکھڑی اُکھڑی ہوتی ہو اور ان کے فقرے بے ربط ہوتے ہیں اسی طرح گانو کے رہنے والے شہر والوں کے مقابلے میں اپنا مافی الضمیر صفائی اور صراحت سے نہیں بیان کر سکتے۔ ان کی زبان ناقص ہوتی ہے، وہ اپنے مطالب کے لیے ٹھیک

حاشیہ صفحہ ۱۶

مضمون نگار نے جس کے مضمون کے اقتباس میں نے یہاں درج کیے ہیں، ہمیں یقین دلایا ہو کہ دھرم سنگھ کی تاریخ جو ہندی میں لکھی گئی ہو اس کا سمجھنا دشوار ہو۔ یہ کتاب سررشتۂ تعلیم کی طرف سے شایع کی گئی ہو۔ اس کتاب میں پچیس تیس الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جنھیں انھوں نے کبھی اپنی عمر میں نہیں سنا جنھیں غالباً وہ کبھی عمر بھر نہیں سنیں گے۔

[1] یہ مضمون "اتالیق پنجاب" مورخہ جون ۱۸۷۰ء میں شایع ہوا ہو۔ (اس جگہ فرانسیسی عبارت سے اُردو ترجمہ کیا گیا ہو۔ مترجم)

لفظ اور اس طرح استعمال کرنا نہیں جانتے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں آپ یہی حالت پائیں گے۔ اس میں کسی ایک زبان کو دوسری پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ جب تک کہ کوئی زبان مکمل نہ ہو جائے اس کے خط و خال نمایاں نہیں ہوتے اور اسے ہم اعلا درجے کی زبان نہیں کہہ سکتے۔ اگر ہم اپنی زبان میں لفظ "پانی" "آب" یا "واٹر" استعمال کریں تو مطلب سب لفظوں سے ایک ہی ہوگا۔ لیکن ان میں سے ایک لفظ کو ہم فصیح کہتے ہیں اور دوسرے کو غیر فصیح۔ دراصل ہمیں الفاظ پر نہیں جانا چاہیے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان قائم ہونے کی بدولت بعض زبانوں کو نشو و نما کا پورا موقع ملا اور انھوں نے اپنی ایک مخصوص صورت اختیار کر لی۔ مثلاً عربی، سنسکرت اور یونانی اپنے مخصوص خط و خال رکھتی ہیں اور ان میں فصاحت و بلاغت کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ ہر زبان میں آپ ترقی یا زوال کا رجحان پائیں گے اور دونوں حالتوں میں ان میں تبدیلیاں پیدا ہونا لازمی ہے۔ ہر صدی کے مشہور مصنفین اپنے زمانے کے ذوق کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتے ہیں۔ چناں چہ گزشتہ صدی کے مشہور شعرا میر تقی اور رفیع سودا نے جو محاورے اور الفاظ استعمال کیے ان میں سے بعض کو اس زمانے کے شعرا نے متروک قرار دیا ہے۔ کوئی زبان اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر زبان میں بعض لفظ متروک ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے الفاظ رواج پاتے ہیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالص زبان اور میل والی زبان میں کیا خاص فرق ہے اور اوّل الذکر کو ثانی الذکر کے مقابلے میں کیوں خاص اہمیت دی جاتی ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی ایک زبان بھی ایسی

کہی جا سکتی ہی جس میں بدیسی الفاظ شامل نہ ہو گئے ہوں ؟ اگر کوئی ایسی زبان موجود ہو تو اس کو ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔ میل والی زبان میں اجنبی الفاظ کچھ عرصے کے استعمال کے بعد کھپ جاتے ہیں اور مقامی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور اس میل والی زبان کو بھی ہم خالص زبان کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہ تمام امور اُردو زبان کی بحث سے خارج ہیں اس واسطے کہ اُردو ایک زندہ زبان ہی اور اس قدر زمانے سے ہندستان میں استعمال کی جا رہی ہی کہ اب اس کو ترک کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہ بحث بالکل بے نتیجہ ہی کہ آیا اُردو ایک خالص زبان ہی یا اس میں دوسری زبانوں کا بھی میل ہی۔ اب ہندو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس کی جگہ ہندی کو رواج دیں جس کا استعمال عرصے سے ترک کر دیا گیا ہی اور جس کی حیثیت ایسی ہی جیسے سنسکرت کی۔ ایک زمانہ تھا جب دلّی والے جامہ پہنا کرتے تھے لیکن اب لوگوں نے یہ لباس ترک کر دیا۔ اگر کوئی یہ لباس پہن کر بازار میں جائے تو لوگ کیا کہیں گے ؟ اکثر لوگ اس کو بہروپ سے تعبیر کریں گے۔ زبانوں کا بھی یہی حال ہی۔ اب اگر آپ "بدن" کی جگہ "شریر"، "آسمان" کی جگہ "اکاس" اور "شیر" کے بجائے "سنگھ" استعمال کریں تو لوگ آپ کی ہر بات سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ فارسی رسمِ خط کی جگہ جو ناگری رسمِ خط استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہی اس کا بھی یہی حال ہی۔ دراصل ایک دفعہ اگر بدیسی الفاظ کسی زبان میں چالو ہو جاتیں تو اس زبان کو خالص بنانے کے لیے اُن کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا اور نہ رسمِ خط کو بدلا جا سکتا ہی۔ فردوسی نے شاہنامے میں عربی الفاظ بالکل نہیں استعمال کیے لیکن کیا دوسرے فارسی شعرا جیسے خاقانی،

انوری اور نظامی وغیرہم اس کا تتبع کر سکے؟ برخلاف اس کے ان شعرا کے ہاں کثرت سے عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس اصول پر ہم اُردو میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں؟ اُردو شہری زبان ہے۔ ہندی دیہاتوں میں استعمال ہوتی اور اس میں بھی بہت سے عربی فارسی لفظ رائج ہو گئے ہیں۔ شہروں میں چھوٹا بڑا اُردو بولتا ہے۔ اور سرکاری دفاتر میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں اخبارات کی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اور ان کی تعداد میں ہر روز مزید اضافہ ہو رہا ہے اُردو میں دوسری زبانوں کے مطالب ادا کرنے کی بھی بہ درجۂ اتم صلاحیت پائی جاتی ہے۔"

۱۴ر جون سنہ ۱۸۷۰ء کے "علی گڑھ اخبار" میں سول سروس کے امیدواروں کا جو زبان کا امتحان لیا جاتا ہے اس کے متعلق نہایت معقول رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اصل میں انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ "اس کی کیا وجہ ہے کہ سول سروس کے امتحان میں جو اُردو کا معیار رکھا گیا ہے اس کو اور زیادہ بلند نہیں کیا جاتا۔ اُردو کی معمولی نثر اور گفتگو کی مشق سے یہ صلاحیت نہیں پیدا ہو سکتی کہ فلسفیانہ مضامین کو سمجھا جا سکے یا شعرا کے کلام کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے جو ہندستان میں بہت مقبولیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اُردو زبان تجارتی اغراض کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ یہ ہندستان کی مشترکہ زبان ہے اور پنجاب سے لے کر مدراس تک سمجھی جاتی ہے۔ بالخصوص پچھلے بیس برسوں میں اُردو کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ چناں چہ سول سروس کے امتحان کا سنہ ۱۸۶۰ء کا نصاب دیکھیے اور اس کا اس سال کے نصاب سے مقابلہ کیجیے تو آپ کو اس ترقی کا اندازہ ہو سکے گا جو اُردو زبان

نے کی ہی۔ اب ہر صوبے کی زبان کو بھی اہمیت دی جا رہی ہی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ صوبے آپس میں ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جائیں گے۔ چناں چہ بنگال کے صوبے میں بنگالی، بمبئی میں گجراتی اور مرہٹی اور مدراس میں تامل اور تلگو تسلیم کی گئی ہیں۔ لیکن ان صوبہ جاتی زبانوں کے متعلق جو دلچسپی ظاہر کی جا رہی ہی اس کا کوئی عملی نتیجہ برآمد نہیں ہوا بلکہ الٹا اثر نظر آرہا ہی جس کا اظہار بمبئی میں ہو رہا ہی۔ اس صوبے کی حکومت نے ان سبھوں کے لیے جو سرکاری ملازمت کے خواہاں ہیں، اُردو کی تعلیم گزشتہ سال سے لازمی قرار دے دی ہی۔ ہمیں توقع ہی کہ صوبۂ مدراس میں بھی اس کی تقلید کی جائے گی اور اُردو زبان اس طرح سارے ہندستان کے لیے مبادلۂ خیالات کا ذریعہ قرار پائے گی۔ دراصل وہ تمام رُجحانات جن سے مشترک زبان کی جو دوسری زبانوں پر حاوی ہی، ترقی کی صورت پیدا ہو، ہمت افزائی کے مستحق ہیں۔ اس سے یہ ہو گا کہ تجارتی اور سول تعلقات میں سہولت پیدا ہو گی۔ تجربے نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہی کہ مشترک زبان کی حیثیت اُردو ہی کو حاصل ہی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بنگال کے سول سروس کے امتحان میں بنگالی یا ہندی کے ساتھ اُردو میں امتحان لیا جائے گا، بمبئی میں گجراتی اور مرہٹی کے دوش بہ دوش اُردو کو رکھا جائے گا اور مدراس میں اُردو کو تامل یا تلگو کے ساتھ شریکِ نصاب رکھا جائے گا۔[1]

---

[1] اگرچہ صوبۂ بنگال کی زبان بنگالی ہی لیکن اُردو، جیسے کہ میں پیشتر بہ وضاحت بیان کر چکا ہوں، وہاں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہی۔ چناں چہ راجا کالی کرشن پرشاد نے حال ہی میں ملکۂ وکٹوریہ کی سال گرہ کے موقع پر سنسکرت زبان میں جو نظم لکھی تھی اس کا انھوں نے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ کیجیے

باوجود ان مباحث کے جن کی نسبت ہم نے ابھی ذکر کیا ہو اُردو ہندستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے مسلّم ہو۔ ڈیوک آف اڈنبرا نے اسی زبان میں اپنے دَورانِ سفر میں تقریریں کیں اور اسی زبان میں ڈیوک موصوف کی تعریف و توصیف میں قصائد[1] لکھے گئے جن کے متعلق اُردو اخبارات سے ہمیں اطلاع ملی[2]۔ آج کل ساؤتھ کنزنگٹن میوزیم میں شہزادۂ ابرٹ کے مجسمے کی جو نمایش ہو رہی ہو اس کے نیچے اُردو زبان میں کتبہ لکھا گیا ہو۔ یہ مجسمہ ایک دولت مند پارسی مسٹر سیسوں، نے بمبئی کے "وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم" کو بہ طورِ تحفہ پیش کیا تھا۔

بہت کچھ پس و پیش کے بعد انگریزی حکومت نے کروڑوں کے خرچ سے دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا ہو۔ نوجوان ہندستانیوں کو ان کی مادری زبان مفت سکھائی جا رہی ہو حالاں کہ انگریزی کی تعلیم کے لیے طلبہ کو خود خرچ کرنا پڑتا ہو۔ انگریزی زبان کی تعلیم صرف اعلا طبقے کے ہندستانی نوجوان حاصل کرتے ہیں جو حکومت میں ملازمت کے خواہاں ہیں۔ میرے خیال میں حکومت کا طریقِ عمل اس باب میں نہایت قابلِ تحسین ہو۔ بعض ہندو لوگ اس پر اعتراض کر رہے ہیں لیکن واضح رہے کہ یہ وہی اصحاب ہیں جو اُردو کے مخالف

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱ :۔ اُردو میں بھی ترجمہ شایع کیا ہو اور اس کی ایک نقل مجھے بھی بھیجی ہو۔ یہ بات قابلِ ذکر ہو کہ موصوف نے اس کا بنگالی میں ترجمہ شایع نہیں کیا۔

[1] بعض قصائد فارسی اور سنسکرت میں بھی لکھے گئے تھے۔ سنسکرت کی نظموں کو ہری چندر نے شایع کیا ہو۔ یہ مجموعہ ۲۴ صفحات پر مشتمل ہو۔

ہیں اور انگریزی کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر ہر ایک کو معلوم ہے کہ برطانوی ہند کے چھوٹے بڑے عہدے دار اُن صوبوں میں جہاں اُردو بولی جاتی ہے اسی زبان میں اپنی تقریریں کرتے ہیں۔ یہ سب تقریریں عام فہم اور بعض نہایت فصیح و بلیغ ہوتی ہیں۔ خاص طور پر صوبۂ شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور کی تقریروں کا معیار بہت بلند ہوتا ہے۔ موصوف میری طرح ہندی کے مقابلے میں اُردو کے زبردست حامی ہیں۔ خاص طور پر مجھے موصوف کی وہ تقریر پسند آئی جو انھوں نے گزشتہ فروری کی ۷ تاریخ کو ضلع علی گڑھ کے سرکاری مدرسے کے افتتاح کے موقع پر ہندستانیوں کی ایک بڑی جماعت کے روبرو کی تھی۔[1]

ان انگریزوں میں جو ہندستانی زبان میں بلا تکلف اظہارِ خیال کرسکتے ہیں، کلکتے کے معزز اسقف ملین صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موصوف کے پیش رو ہیبر کو Reginald Heber جو یورپ میں اپنے ان خطوط کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں جو انھوں نے اپنے سفر کے متعلق لکھے اور جن کی لکھی ہوئی دعائیں انگلستان کے کلیساؤں میں آج تک گائی جاتی ہیں۔ ہندستانی زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ موصوف کی شادی مشہور مستشرق سر ولیم جونس کی بھانجی کے ساتھ ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ موصوفہ کا گزشتہ مئی کے مہینے میں انتقال ہوگیا اس سے کچھ دنوں بعد جب کہ موصوفہ کے پہلے شوہر کونٹ وسچی نے

---

[1] اس مدرسے کی افتتاحی رسم کے متعلق تمام تفصیلات اور اس تقریر کا متن اُردو اور انگریزی دونوں میں "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۱۱ فروری ۱۸۷۰ء میں شایع ہوچکا ہے۔

جو ہماری فنونِ لطیفہ کی اکاڈمی کے ۱۸۱۵ء سے برابر نامہ نگار تھے، انتقال کیا۔

مَیں نے ان مشہور انگریزوں کے ذکر کے سلسلے میں جنھیں ہندستان اور ہندستانی کے ساتھ دل چسپی ہی، سر چارلس ٹریویلین کا بارہا ذکر کیا ہی۔ مدراس کے ہندستانی موصوف کی انتظامی قابلیت اور ہمدردانہ رویے کو ابھی بھولے نہیں ہیں۔ اب آج کل وہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث ہی کہ شہرِ مدراس میں موصوف کی یادگار کے طور پر ایک مجسمہ بنایا جائے۔ دراصل موصوف اس عزت واحترام کے مستحق ہیں۔ ہمیں امید ہی کہ اس تجویز سے عام طور پر اتفاق کیا جائے گا۔

ہندوؤں میں ہندی زبان کے ساتھ جو دل چسپی ظاہر کی جارہی ہی اس کا اظہار فطری طور پر ادبیات کے میدان میں کیا جارہا ہی۔ آج کل ہندی زبان میں چندسال قبل کے مقابلے میں، تصانیف کی تعداد بہت بڑھ گئی ہی۔ اب تک ہندی صرف ونحو پر چھوٹے چھوٹے رسالے شایع ہوئے ہیں لیکن اب ہندی صرف ونحو پر ایک مستند کتاب لکھنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہی۔ چناں چہ مشہور مسیحی مبلغ مسٹر ایتھرنگٹن نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہی اور ہندی صرف ونحو پر ایک کتاب بنارس سے شایع کی ہی۔ اس کتاب میں مصنف نے بنارس کی بول چال کی زبان کو اصلی ہندی قرار دیا ہی۔ موصوف کا خیال ہی کہ بنارس کی ہندی بالکل خالص ہی۔ یعنی اس میں سنسکرت کا عنصر بہت زیادہ ہی۔ حالاں کہ آگرے کی ہندی کو اصلی ہندی کہنا چاہیے۔ جیسا کہ فٹز ایڈورڈ ہال کا خیال ہی جنھوں نے اس کتاب کے متعلق بھی یہی رائے ظاہر کی ہی کہ وہ عیب سے بالکل پاک نہیں ہی اور اس کتاب

سے بڑی حد تک اس مقصد کی تکمیل ہو جاتی ہو جس کے بعض لوگ آرزومند تھے۔ اس کتاب میں ایک باب ہندی عروض پر ہی جو مُنگھیر کے مسٹر کرسچین نے لکھا ہی۔ یہ باب زیادہ مفید ہوسکتا تھا اگر صاف اور عام فہم زبان میں تحریر کیا جاتا۔ مجھے افسوس ہی کہ مصنفِ کتاب نے جو ایک مشہود فاضل اور مبلغ ہیں، اپنی تمہید میں اس تعصب کا اظہار کیا ہو جو ہندو لوگ عموماً اُردو کے خلاف ظاہر کیا کرتے ہیں۔ چناں چہ موصوف نے بھی یہ رائے ظاہر کی ہی کہ اُردو صرف مسلمانوں تک محدود ہی حالاں کہ واقعات اس کے بالکل خلاف ہیں[1] پھر موصوف کا خیال ہی کہ ہندی زبان سنسکرت سے نکلی ہی لیکن یہ مختلف فیہ مسئلہ ہی جس طرح جنوب میں تامل بولی جاتی ہی اس طرح شمالی ہند میں سنسکرت کے علاوہ ایک زبان بولی جاتی تھی جس کا اثر ہندی میں موجود ہی۔

ہندی کے ہم عصر مصنفین میں بابو شیو پرشاد اچھے لکھنے والوں میں ہیں، موصوف نے ایک مجموعہ شایع کیا ہی جس میں بعض غیر مطبوعہ حصّے بھی شایع کیے گئے ہیں مثلاً "راجا بھوج سپنا" جس میں نجات کی راہ بتائی گئی ہی اور "بیر سنگھ کا روتنت" جس میں قصّے کے پیرائے میں بچوں کے قتل کو مذموم قرار دیا گیا ہی۔ یہ دونوں قصّے بابو صاحب کے طبع زاد ہیں۔ کنوّر لکشمن سنگھ نے سنسکرت کے ناٹک شکنتلا کا ہندی ترجمہ کیا ہی جو اس مجموعے میں ہی۔ اس کے علاوہ پدماوت کے

---

[1] ۱۲ اپریل ۱۸۶۸ء کے "اودھ اخبار" میں منشی محمد خاں نے یہ دعوا پیش کیا ہی کہ اودھ والے سب اُردو بولتے ہیں اس میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں ہی۔ اگر کوئی شخص اُردو کے لفظ کی جگہ ہندی کا لفظ استعمال کرے تو کوئی اسے نہیں سمجھے گا۔

بعض حصے جس میں دہلی کے شہنشاہ علاءُالدین خلجی اور چتور کے راجا کی بیوی پدماوتی کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

ہندی کے ایک دوسرے فاضل پنڈت رامجس ہیں۔ انھوں نے بھی ہندی کا ایک مجموعہ شایع کیا ہے جو خاص طور پر عورتوں کے لیے ہے۔ انھیں اس مجموعے کے شایع کرنے کے سلسلے میں پانچ سو رُپے صوبۂ شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے دلوائے ہیں۔ یہ مجموعہ چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کا نام "سکشا سجودھنی" ہے۔[1]

جو یورپین لوگ ہندستانی کی اس شاخ (ہندی) کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے مشہور مستشرق فٹز ایڈورڈ ہال کی لکھی ہوئی "ہندی رِیڈر" بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس میں بھی ہندی زبان کی بہترین کتابوں میں سے اقتباسات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مشکل الفاظ کی تشریح بھی کر دی ہے جو عام لغتوں میں نہیں ملتے۔ اس کتاب کی تعریف جتنی کی جائے کم ہوگی۔ میں اس کتاب کی خصوصاً مستشرقین کے لیے سفارش کروں گا۔ مسٹر جے بیمز جو ایک مشہور مستشرق ہیں اور آج کل چند بردے کی نظم "پرتھوی راج راسو" کا انگریزی ترجمہ کر رہے ہیں ان کے لیے بھی یہ کتاب مفید ہوگی۔

جے بیمز نے اپنے ترجمے کے نمونے کے طور پر اس کتاب کی نویں فصل "پروسیڈنگز آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" میں شایع کی ہے۔ اس نمونے کو دیکھ کر ترجمے کی خوبی نیز اصل کتاب کی اہمیت کا اندازہ اہلِ نظر کر سکتے ہیں۔ اسی رسالے کے اکتوبر کے پرچے میں ان قلمی کتب کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں جو موصوف نے

---

[1] "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۲۲ اپریل ۱۸۷۰ء

اپنا متن تیار کرنے کے لیے استعمال کی ہیں انھوں نے "جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" کے چوتھے نمبر میں مسٹر گراؤس کے اعتراضات کا جواب دیا ہی۔ یہ اعتراضات نہایت مہمل ہیں۔ مسٹر گراؤس نے جس طرح مسٹر بیمز کے ساتھ ناانصافی روا رکھی ہی اسی طرح وہ ہندستانی زبان کے بدخواہ ہیں۔

ڈیوک آف آرگائل نے جو آج کل وزیرِ ہند ہیں، یہ فیصلہ کیا ہی کہ سکھوں کی مقدس کتاب "ادی گرنتھ" کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اس کام کے لیے ڈاکٹر ٹرمپ کو مقرر کیا گیا ہی جو اس سے قبل سندھی اور پشتو زبان کے متعلق کافی کام کر چکے ہیں۔ اب موصوف کو جس متن کا ترجمہ کرنا ہی وہ دو ہزار تین سو صفحات پر مشتمل ہی اور ہندی کی مختلف بولیاں اس میں استعمال کی گئی ہیں۔ آپ قلمی نسخوں کے علاوہ "ادی گرنتھ" کے اس ایڈیشن کو پیشِ نظر رکھیں گے جو دیوان بوٹا سنگھ نے لاہور سے شایع کیا ہی۔[1] میری دعا ہی کہ یہ فاضل شخص اس کام کو جس کی اہمیت ظاہر کرنا غیر ضروری ہی، پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ پروفیسر جے ڈاؤسن نے اس کے متعلق ایک یادداشت لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے پیش کی ہی اور مثال کے طور پر بعض حصوں کا انگریزی ترجمہ پیش کیا ہی۔ موصوف نے بتایا ہی کہ "ادی گرنتھ" کی زبان مختلف لوگوں کی زبان ہی۔ یہ دراصل قدیم ہندی ہی نہ کہ اصلی پنجابی اور بعض مناجاتیں تو دکنی اُردو کی ہیں۔ انڈیا آفس کا قلمی نسخہ میرے ذاتی نسخے کی طرح گرمکھی میں لکھا ہوا ہی اور ۵۴ حصوں میں

---

[1] یہ ایڈیشن ۱۸۷۴ صفحات پر مشتمل ہی جیسا کہ Trubners Literary Record مورخہ ۲۵ نومبر ۱۸۷۰ء سے ظاہر ہوتا ہی۔

منقسم ہی جو راگ یا راگنی کہلاتے ہیں۔ راگ اور راگنیاں "محل" اور "گھروں" میں تقسیم کی گئی ہیں[1]

بابو ہری چندر کا ہندی ادب کی ترقی کے متعلق جوش اور انہماک بہ دستور جاری ہی ان کے "کوی بچن سدھا" کی اشاعت جاری ہی۔ اس کے علاوہ موصوف دوسری ہندی کتب بھی شایع کر رہے ہیں۔ ہندی کی جو نئی کتابیں مجھے موصول ہوئی ہیں ان میں ایک کتاب ہی جس میں شاستروں سے سنسکرت اقتباسات یہ ثابت کرنے کے لیے درج کیے گئے ہیں کہ عقدِ بیوگاں جائز ہی۔ اس کے خلاف جملہ دلائل کو رد کیا گیا ہی یہ کتاب لاہور میں چھپی ہی۔ یجروید کی ہندی تفسیر کئی جلدوں میں بیما کے راجا نے شایع کی ہی جو سنسکرت میں تبحر کے باوجود اپنی مادری زبان میں لکھنا کسرِ شان نہیں سمجھتا[2]۔

آپ صاحبوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اُردو ادب کی ترقی کی رفتار سُست ہو گئی ہی۔ نہ صرف اُردو جرائد کی تعداد ہندی جرائد کے مقابلے میں زیادہ ہی بلکہ اور دوسری مطبوعات بھی اُردو کی زیادہ شایع ہوئی ہیں۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے اُردو میں اپنے سفرِ حجاز کے حالات لکھے ہیں اور انگریزی میں بھی ان کا ترجمہ نہایت آب وتاب کے ساتھ شایع ہوا ہی۔

اودھ اخبار مورخہ ۳ مئی ۱۸۶۹ء میں اُردو کی ۲۷ کتابوں کی فہرست

---

[1] میں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندستانی" میں اس کے متعلق ذکر کیا ہی جہاں بیر اور نانک کے متعلق بیان ہی۔

[2] ٹربز ریکارڈ نمبر ۵۹

درج ہو ان میں سے بعض نئی ہیں اور بعض پُرانی ہیں جو دوبارہ شایع ہوئی ہیں۔ علی گڑھ کی سائینٹفک سوسائٹی کے زیرِ اہتمام متعدد اُردو کی کتابیں تیار ہو رہی ہیں[1]۔

کپتان ہولرائڈ نے مجھے "سلم الادب" کا ایک نسخہ بھیجا ہے۔ اس کتاب میں عربی زبان کے صحیح استعمال کے متعلق ہدایات ہیں۔ اس میں کہانیوں کا ایک مجموعہ پیش کیا گیا ہے اور نثر اور نظم کے نمونے ہیں جن کا ساتھ ساتھ اُردو ترجمہ بھی درج ہے اور مشکل الفاظ کی تشریح اُردو میں ہے۔ یہ کتاب خطِ نسخ میں ہے۔

ٹی ڈبلو اوٹولبرٹ سول سروس کے ان لوگوں میں ہیں جو ہندستانی زبان کے بڑے ماہر ہیں۔ موصوف نے جارج کیمبل کی تصنیف "ہندستان کی نسلیں" کا نہایت صاف اور شستہ اُردو میں ترجمہ شایع کیا ہے۔ کلکتے کے "جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی" میں اصل کتاب مضامین کی شکل میں شایع ہو چکی ہے۔

ہندستانی زبان کی دکھنی شاخ کے متعلق جس میں شعر و افسانے پر کثرت سے کتب شایع ہو رہی ہیں، میجر ڈبو کار نے مدراس میں بعض کتابوں کے شایع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ وہ کتابیں یہ ہیں:۔ (۱) قصۂ رضوان شاہ" مصنفۂ فیض زیرِ طباعت ہے۔ (۲) نصرتی کی "گلشنِ عشق" اور "پھول بن"[2]۔ (۳) "قصۂ بی بی مریم"۔ بھی عنقریب شایع ہونے والی ہے۔ ان سب کتابوں میں ان ٹھیٹ دکھنی الفاظ کی تشریح کی گئی ہے جو

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ ۳ اپریل ۱۸۶۹ء

[2] نصرتی کے متعلق ملاحظہ ہو میری کتاب "تاریخ ادب ہندستانی"

عام طور پر نہیں سمجھے جاتے۔ اس میں سے جو کتابیں مجھے موصول ہوتی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جو کچھ کام ہوا ہے اس کی سب ہندستانی ادب کے حامیوں کو ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ جیسا کہ خود فیلن نے اپنی کتاب کے دیباچے میں افسانوں کو حقیر نہ سمجھنے کے متعلق اشارہ کیا ہے:

"حکم کا مقولہ ہے افسانوں کا مقصد نصیحت ہے افسانوی اشخاص سے آدمی خود اپنے متعلق بہت کچھ معلوم کر لیتا ہے اور کہاوتوں کی شکل میں آدمی کو بہت کچھ یاد رہ جاتا ہے۔"

مسیحی مبلّغین یا خود ہندستانیوں کے زیرِ اہتمام جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کی فہرست دینا موجبِ طوالت ہوگا۔ ان کے متعلق جان مردوش John Murdoch نے ایک نہایت مفید فہرست شائع کی ہے جسے دیکھنے سے آپ ان مطبوعات کے متعلق خیال قائم کر سکتے ہیں۔[1] اُردو، ہندی اور ہندستان کی دوسری زبانوں میں جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں اس میں بعض ایسی ہیں جو ہندستان سے باہر والوں کے لیے بھی دل چسپی کا موجب بن سکتی ہیں۔ اگر ہم صرف ایسی کتابیں گنائیں تو وہ بہت زیادہ نکلیں گی اور ان کا ایک مستقل کتب خانہ قائم ہو سکے گا۔

بابو جنم جیا مترا کا نیا تذکرہ جس کا نام "نسخۂ دل کش" ہے عنقریب شائع ہونے والا تھا لیکن مصنف کے بے وقت انتقال کی وجہ سے اس کی طباعت کا کام روک لیا گیا۔ بابو صاحب مشہور فاضل رجندر لال مترا کے والد تھے۔ اس تذکرے میں ہندستانی کے شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے۔

---

[1] Catalogue of the Christian Vernacular Literature of India مطبوعہ مدراس ۱۸۷۰ء مشتمل بہ ۲۱۲ صفحات

اس میں ۶۷۷ شاعروں اور ان ۱۳ اشاعرات کا حال قلم بند کیا گیا ہے جو ۱۱۷۳ھ ہجری سے لے کر ۱۲۶۵ھ ہجری تک گزرے ہیں۔ ہر ایک کے کلام کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ بابو رجندرلال مترا نئی روشنی کے آدمی ہیں۔ نہ معلوم وہ اس تذکرے کو پورا چھپوائیں گے یا نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید وہ اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کریں۔ انھوں نے مجھ سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ اس حصے کی جو اب تک چھپا نہیں ہے، ایک قلمی نقل بھیج دیں گے لیکن وعدہ ابھی پورا نہیں کیا گیا۔[1]

گزشتہ سالوں میں متعدد یورپین فاضلوں نے سیرت رسول پر کتابیں لکھی ہیں۔ سر ولیم میور اور ڈاکٹر اے اسپرنگر کی تصانیف خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ تصانیف ہیں چاہے کتنی بھی غیر جانب دار معلوم ہوں لیکن مسلمان انھیں قابلِ اطمینان نہیں سمجھتے۔ ابھی حال میں ہندستان کے مشہور مسلمان سید احمد خاں نے رسولِ عربی کی سیرت پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "سیرتِ مصطفیٰ" ہے۔[2] یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے لیکن عربی اور عبرانی کے حوالے اصل زبانوں میں ہیں۔ سر سید احمد خاں گزشتہ ستمبر کے مہینے میں انگلستان سے ہندستان واپس ہو گئے اور بنارس میں اپنی ججی کی خدمت کا جائزہ حاصل کر لیا۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں عربستان کے جغرافی حالات اور قدیم عربوں کے مذہب و رسوم کے متعلق بحث کی ہے۔ اسلامی دینی عقائد پر تبصرے

---

[1] "نسخۂ دل کش" جلد اول مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۰ء۔ ۲۱۰ صفحات۔ ہر صفحے پر ۲۰ سطریں ہیں۔

[2] غالباً مصنف کی مراد "خطباتِ احمدیہ" سے ہے۔

کے ساتھ یہ بتایا ہو کہ مذہب اسلام سے انسانیت کو کیا فوائد حاصل ہوئے۔ قرآن اس کی زبان اور وہ پیشین گوئیاں جو اس میں ہیں، ان پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہو۔ اس کتاب میں نقشے بھی ہیں۔ ہمیں توقع ہو کہ مصنف ہندستان واپس ہونے کے بعد اس موضوع پر اپنی تحقیق جاری رکھیں گے۔

ادبی خدمات کے صلے میں حکومت کی طرف سے مصنفین کو جو انعامات دیے جاتے ہیں ان سے بھی ہمت افزائی ہو رہی ہو۔ جنوری ۱۸۷۰ء میں لفٹنٹ گورنر صوبہ جات شمال مغربی نے جو دربار منعقد کیا اس میں بعض مصنفین کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ یہ دربار نہایت تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا اور خوب کامیاب رہا۔ اس میں ۲۴ والیانِ ملک، بڑے بڑے زمیں داروں اور سرداروں نے شرکت کی۔ لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے اس موقع پر ہندستانی زبان میں تقریر کی اور سب حاضرین کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے الہ آباد میں یونی ورسٹی قائم کرنے کے متعلق ان کی اپیل پر لبیک کہا۔ موصوف نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ ہمیں صرف یونی ورسٹی قائم کرنے تک اپنی مساعی کو محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ جدید قومی ادب، کی بھی بنا ڈالنی چاہیے جو اہلِ ہند کے جدید حالات کا ترجمان ہو۔ اس اعلا مقصد کے لیے حکومت نے انعامات مقرر کیے ہیں جو ان مصنفین کو دیے جائیں گے جن کی تصانیف اعلیٰ معیار پر پوری اُتریں گی اور مفید ثابت ہوں گی۔

لفٹنٹ گورنر کی اس تقریر کے بعد جس کا ہم نے مختصراً ذکر کیا ہو، مسٹر کیمپس ناظمِ تعلیمات صوبہ جاتِ شمال مغربی نے محمد نذیر احمد کو آگے لاکر پیش کیا جنھیں ان کی تصنیف "مرآت العروس" پر انعام دیا گیا اور

آگرے کے پنڈت کاشی ناتھ کی تصنیف "اخلاق" پر انعام دیا گیا۔ ان مصنفین کو ایک ہزار رُپے کی رقم بہ طورِ انعام دی گئی۔ دونوں کی تصانیف اُردو زبان میں ہیں۔ اس کے بعد دوسرے انعامات تقسیم کیے گئے۔ پھر پان اور عطر حسبِ معمول تقسیم کیا گیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

اَعلام جب مشرقی رسمِ خط میں لکھے جاتے ہیں تو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں پیدا ہوتی لیکن جب انھیں لاطینی یا رومن رسمِ خط میں لکھا جاتا ہے جیسا کہ آج کل کیا جا رہا ہے تو اس صورت میں غلطی کا امکان ہے۔ لاطینی کے رسمِ خط کے متعلق کوئی قواعد اب تک مقرر نہیں کیے گئے ہیں چنانچہ دو طریقے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اس وقت رائج ہیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کا طریقِ تحریر بالکل انگریزی اصول پر مبنی ہے اور اس پر ہندستان میں عرصے سے عمل کیا جا رہا ہے۔ دوسرا طریقِ تحریر ڈبلو جونس کا ہے جو تمام یورپین لوگوں کے لیے نسبتاً زیادہ قابلِ قبول ہے۔ شروع میں ثانی الذکر طریقِ تحریر کی مخالفت کی گئی اور اس کو کُلیتاً ترک کرنے کا ارادہ کیا گیا لیکن کچھ عرصے سے پھر اس کو مقبولیت حاصل ہو گئی ہے۔ ڈبلو جونس ہی کے طریقِ تحریر کو چند معمولی تبدیلیوں کے ساتھ حکومت نے اعلام کے لکھنے کے لیے اختیار کر لیا ہے چنانچہ ڈبلو ہنٹر کو مقرر کیا گیا ہے کہ متذکرہ اصول کے مطابق صوبۂ بنگال کے تمام مقامات کے نام تحریر کیے جائیں[1]۔ یہ کام بہت ضروری تھا اس لیے کہ طریقِ تحریر کے اختلاف کے باعث یورپ میں بعض لوگ ایک ہی مقام کو دو علاحدہ علاحدہ مقامات تصور کرنے لگے۔ حکومت نے صرف

---

[1] انڈین میل مورخہ ۵ جنوری ۱۸۷۰ء

صوبۂ بنگال کے لیے جو عمدہ طریقِ عمل اختیار کرلیا ہی اگر اسے پورے ہندستان کے لیے اختیار کیا جائے تو وقت کی ایک ضرورت پوری ہوجائے گی اور لوگوں کے لیے سہولت کا موجب ہوگا۔

اس سال مَیں آٹھ اُردو کے نئے اخبارات اور تین ہندی کے نئے اخبارات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اہلِ ہند میں اب یہ خواہش پیدا ہوگئی ہی کہ ان کے روزانہ اور ہفتے وار اخبارات میں پڑھنے کے لیے زیادہ مواد مہیا کیا جائے۔ ہندستانی اور دوسری دیسی زبانوں کے اخبارات ان گوشوں میں پہنچتے ہیں جہاں انگریزی اخبارات کے توسط سے مغربی تہذیب وتمدن کے خیالات اہلِ ہند کو پہنچ رہے ہیں جن کو قبول کرنے کے لیے وہ بے تاب معلوم ہوتے ہیں۔ جن خیالات کو آپ اہلِ ہند تک پہنچانا چاہتے ہیں ان کا ضبطِ تحریر میں آنا بہت اچھا ہی۔ بعض اوقات اخبارات کی معمولی خبریں ان کے لیے خاص اہمیت اختیار کرلیتی ہیں۔ فارسی شاعر نے لاطینی مقولے کو یوں بیان کیا ہی "اپنی نوکِ قلم سے اپنے خیالات کو متعیّن کردے اس لیے کہ جو بات صرف زبانی رہتی ہی وہ لوگوں کے حافظے سے محو ہوجاتی ہی"

بعض اخبارات ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ایک کالم میں اُردو رکھتے ہیں اور دوسرے میں ہندی مَیں اپنے خطبات میں اس قسم کے متعدد جرائد کی نسبت تذکرہ کرچکا ہوں۔ اس کا نام "برتند" ہی۔ یہ کئی سال سے کلکتے سے شائع ہوتا ہی۔ نہ صرف اُردو اور ہندی بلکہ چار اور دوسری دیسی زبانیں اس اخبار میں نظر آتی ہیں۔ میرے پیشِ نظر حال کے پرچوں میں اُردو، ہندی اور مرہٹی تینوں زبانیں اس میں استعمال کی گئی ہیں۔ اب مَیں جدید اخبارات کی فہرست دیتا ہوں:۔

اخبار دبدبۂ سکندری۔ یہ اُردُو کا اخبار ہی جس کے مدیر محمد حسین ہیں۔ یہ رام پور سے شایع ہوتا ہی۔

امرت بازار پترکا۔ یہ ہندی کا اخبار ہی جس کے متعلق مَیں اب تک ناواقف تھا۔ اس کا مجھے "علی گڑھ اخبار" کے ذریعے سے علم ہوا۔

انوار الشمس۔ یہ اُردُو کا اخبار ہی جس کی نسبت میری کتاب تاریخ ادبِ ہندستانی" کے تیسرے حصے میں تفصیل موجود ہی۔ (ملاحظہ ہو میری کتاب کا دوسرا ایڈیشن)

ہُمائے پنجاب۔ یہ اخبار اس سال ۱۵ اپریل سے شایع ہونا شروع ہوا ہی۔ اس اخبار میں مضامین کے علاوہ انگریزی اخباروں سے ماخوذ خلاصے ہوتے ہیں، خبریں ہوتی ہیں اور اُردُو اور ہندی کی جدید کُتب پر تبصرے ہوتے ہیں۔ نامہ نگاروں کے صِرف وہ خطوط درج کیے جاتے ہیں جو دلچسپی رکھتے ہوں اور ان کے علاوہ سرکاری اطلاعیں درج کی جاتی ہیں۔ میرٹھ کے "اخبار عالم" نے اس اخبار کے نام پر اعتراض کیا تھا لیکن اگر دیکھا جائے تو ہندستان میں بہت سے ایسے اخبارات ملیں گے جن کے نام عجیب و غریب ہیں۔ اس اخبار کے طرزِ انشا پر بھی اعتراض کیا گیا ہی کہ اس میں یورپین اثر حد سے زیادہ پایا جاتا ہی[1]

---

[1] انڈین میل، مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۰ء

جگت سماچار - یہ ہندی نام اُردو کے "اخبارِ عالم" کا ترجمہ ہی۔ یہ پرچہ
محمد وجاہت علی نے ازراہِ عنایت مجھے بھجوادیا ہی۔ یہ
گزشتہ سال سے میرٹھ سے نکل رہا ہی۔ اس کا مدیر
اور "اخبارِ عالم" کا مدیر ایک ہی شخص ہی۔ ہر ہفتے
دوشنبے کے روز اس کی اشاعت ہوتی ہی۔ یہ آٹھ
صفحات پر مشتمل ہوتا ہی اور اس کا بیش تر حصہ اُردو
سے ہندی میں ترجمہ ہوتا ہی۔

چاہے کوئی کچھ کہے لیکن یہ مسلّم ہی کہ اُردو زبان اور دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مستعمل ہی۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہی کہ اس ہندی اخبار کا سب سے اہم اشتہار اُردو میں فارسی رسمِ خط میں ہی۔ اس اخبار میں یہ بات بھی وضاحت سے بیان کر دی گئی ہی کہ اس کی زبان عام فہم ہی اگرچہ ناگری رسمِ خط میں ہی۔ چناں چہ زبان کے اعتبار سے یہ اخبار اُردو کا ہی نہ کہ ہندی کا۔

ماہ وار گزٹ - یہ ماہ وار رسالہ اُردو میں نکلتا ہی جس کا اشتہار میں
نے "اودھ اخبار" مورخہ ۲۵ جنوری ۱۸۷۰ء میں
دیکھا ہی۔

منگل سماچار - یہ ہندستانی اخبار راجا بھیا کے زیرِ سرپرستی نکلتا ہی۔
اس کے ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں، ایک ہندی کا
اور دوسرا اُردو کا۔ اس کا پہلا نمبر اگست ۱۸۶۹ء میں
بھیا سے شایع ہوا ہی۔

رسالہ - یہ مُرادآباد سے اُردو میں شایع ہوتا ہی۔ اس میں مفید

مباحث ہوتے ہیں۔ 'علی گڑھ اخبار' مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۸۶۹ء میں آر۔ ایس سانڈرس نے اس پر تنقید لکھی ہی۔

سرکاری اخبار۔ یہ ناگ پور سے اُردو، ہندی اور مرہٹی تینوں زبانوں میں نظامت تعلیمات کی سرپرستی میں شایع ہوتا ہی۔

شمس الاخبار۔ یہ مسیحی اخبار لکھنؤ کے "امریکن مشن پریس" کی طرف سے شایع ہوتا ہی۔ اس کے متعلق 'اودھ اخبار' مورخہ ۲ر نومبر ۱۸۶۹ء میں ذکر ہی کہ اس کے مضامین دل چسپ ہوتے ہیں۔

مجھے "اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ" کے پرچے برابر پہنچ رہے ہیں۔ یہ اُردو میں ناظمِ تعلیمات صوبۂ شمال مغربی کی طرف سے شایع ہوتا ہی۔ اس صوبے کے ناظمِ تعلیمات مسٹر ڈبلو ہینڈ فورڈ تھے جن کی مجھ پر خاص عنایت رہتی تھی۔ بدقسمتی کی بات ہی کہ ان کی قبل از وقت موت کے باعث ہندستان ایک نہایت روشن خیال حاکم کی خدمات سے محروم ہو گیا۔ انھیں ہندستانیوں اور ان کی زبان کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ میرے بھی وہ قدیم مہربان تھے اور مجھ سے اور ان سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ رہتا تھا۔ ان کا انتقال ۲۹ر اپریل ۱۸۶۹ء لکھنؤ میں ہوا۔ ان پر چیچک کا سخت حملہ ہوا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ یہ وبا ہندستان میں پھیل گئی ہی اور سیکڑوں اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ آئیے، ہم آپ سب یہ سمجھ کر ایک دوسرے کو تسلی دے لیں کہ آج "ہم مختلف کناروں پر پڑے ہوتے ہیں لیکن اپنا پُرخطر سفر ختم کرنے کے بعد سب اکٹھا ہو جائیں گے

اور بالآخر اپنے باپ (پیدا کرنے والے) کے ہاں پہنچ جائیں گے۔"[1]

یکم مئی کے "اودھ اخبار" میں اس ناقابلِ تلافی نقصان کا ذکر اور اس کی تکلیف دہ تفصیلات موجود ہیں۔ لکھنؤ کے شاعر حسین نے اس دردناک واقعے کو ایک مرثیے میں بیان کیا ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ مرحوم کے جانشین مسٹر کالن براؤننگ جو اردو زبان کے بڑے واقف کار ہیں، اس کمی کو اچھی طرح پورا کر دیں گے جو مرحوم کے اٹھ جانے سے پیدا ہو گئی ہے۔

متذکرہ بالا اخبار کی یکم فروری سنہ ۱۸۷۰ء کی اشاعت میں تصوف کی بعض اصطلاحات کی جو دیوانِ حافظ میں آتی ہیں، تشریح کی گئی ہے۔ یکم نومبر کی اشاعت میں بعض ہندستانی الفاظ کے اِملا کے متعلق مفید معلومات ہیں۔ یہ الفاظ حروفِ تہجی کے اعتبار سے لکھے گئے ہیں۔ ہر لفظ کی تشریح کے ساتھ دل چسپ کہاوتیں اور لطائف بیان کیے گئے ہیں اور نثر و نظم کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے قدیم دوست نواب دیومست Boronde dusmsat نے فرانسیسی الفاظ کے متعلق کیا ہے جن کے تبحرِ علمی اور سخن گستری کی دھوم ہے۔

اِس اخبار میں ادب کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے اور اس کے مضامین متنوع اور مفید ہیں۔ اس کی ہر اشاعت میں دو ایک نظمیں ہوتی ہیں جو کبھی اصل ہوتی ہیں اور کبھی انگریزی سے ترجمے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ قصے کہانیاں، کہاوتیں اور مقولے بھی ہوتے ہیں۔ مَیں نے فرحت کی وہ کہانی جو لافونتین La Fo ntain سے ماخوذ ہے، دل چسپی سے پڑھی۔ اس کا

---

[1] یہ اشعار آرسی ٹرنچ کے ہیں۔

عنوان "بھیڑیے اور بکری کا قصہ" ہی۔ فرحت اس زمانے کے اچھے شاعروں میں ہیں۔

بعض نوجوان شعرا کے نام اخبارات میں آرہے ہیں جن کے کلام پر پبلک کو رائے زنی کا موقع مل رہا ہی۔ اس سال جن نئے شعرا کے متعلق مجھے معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ ہیں۔ نجم بنگلوری، ان کی نظم دکن پر "اودھ اخبار" میں شایع ہوئی ہی۔

حضور بلگرامی۔ ان کا ایک نوے بیت کا قصیدہ "اودھ اخبار" نے شایع کیا ہی۔

جودھپور کے وزیر اعظم نے اس قصیدے کے صلے میں ایک دوشالا بھیجا ہی۔ موجودہ نظم و نثر لکھنے والوں میں حضور کی خاص حیثیت ہی۔ وہ انگریزی زبان سے واقف ہی اور کسی انگریزی رجمنٹ میں میر منشی کے عہدے پر فائز رہ چکا ہی۔[1]

"جلسۂ تہذیب لکھنؤ" کے رسائل بدستور شایع ہو رہے ہیں۔ اس انجمن کے معتمد پنڈت شیو نارائن ہیں۔ گزشتہ مئی کے مہینے کے رسالے میں میر اولاد علی پروفیسر ڈبلن یونیورسٹی کا مضمون ہی جس میں انگلستان کی رسوم پر تبصرہ کیا گیا ہی۔ پروفیسر صاحب موصوف آج کل رخصت پر ہندستان گئے ہوئے ہیں۔ یہ فاضل شخص پہلے بھوپال میں مقیم رہا، جہاں اس کا بھائی ڈاکٹر ہی۔ موصوف نے بعد میں شاہ آباد ضلع ہردوئی میں جو ان کا وطن ہی، ایک لکچر دیا جس کا موضوع علم المعاش تھا۔ اس علم کے

[1] دوسرے نوجوان ہونہار شاعر یہ ہیں:- مہر چشم اور خاور۔ آخر الذکر نے راجا محمود آباد کی گدی نشینی پر ایک مشہور قصیدہ لکھا ہی۔ اودھ اخبار، مورخہ ۱۹ اپریل ۱۸۷۰ء

علاوہ سائنس کی تعلیم کے فوائد بھی موصوف نے بیان کیے[1]۔

ہندستانی اخباروں میں بعض اوقات عجیب وغریب قسم کے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں۔ مثلاً آگرے کے ایک اخبار میں میں نے ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان "نور الابصار" تھا۔ اس مضمون میں فرانسیسیوں کے مقابلے میں جرمنوں کی فتح کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ جرمن لوگ مقدس کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ ایک سبب یہ بتایا ہے کہ بادشاہ ولیم کو وید کا وہ منتر معلوم ہو گیا جس سے کامرانی حاصل ہوتی ہے۔ ہندستانی صحافت نگار کہتا ہے کہ شروع ہی سے اگر اس کو یہ منتر معلوم نہ ہوتا تو وہ فتح مند نہ ہوتا۔

میرٹھ کے "اخبار عالم" میں میں نے ایک اور عجیب وغریب مضمون پڑھا جو پہلے بمبئی کے "کشف الاخبار" میں شایع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں یورپین لوگوں کے شادی بیاہ کا حال بیان کیا ہے۔ غالباً امریکی عورتوں کی بُرائی مدنظر معلوم ہوتی ہے۔ مضمون نگار لکھتا ہے:۔ "فرانسیسی عورتیں ایک ایسا شوہر پسند کرتی ہیں جس کی پیشانی کشادہ اور چہرہ ہنس مُکھ ہو۔ جرمن عورتیں ایسا شوہر پسند کرتی ہیں جو ان کی مرضی پر چلے اور اپنے وعدے کا پابند ہو۔ ولندیزی عورتیں ایسا شوہر پسند کرتی ہیں جو امن وعافیت پسند ہو، کسی جھگڑے بکھیڑے میں نہ پڑے اور لڑائی دنگا نہ کرے۔ ہسپانوی عورتیں ایسا شوہر پسند کرتی ہیں جو اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کر سکے اور ضرورت ہو تو انتقام کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اطالوی عورتیں ایسے شوہر کو پسند کرتی ہیں جو خیال وخواب کی دنیا میں زندگی بسر

---

[1] "جلسۂ تہذیب لکھنؤ" میں یہ لکچر شایع ہوا ہے۔ مورخہ فروری ۱۸۷۰ء

کرتا ہو۔ روسی عورتیں ایسے شوہر کو پسند کرتی ہیں جو اہلِ مغرب کو وحشی سمجھتا ہو۔ ڈنمارک کی عورتیں ایسے شوہر کو پسند کرتی ہیں جو اپنے بس میں رہے اور باہر سفر کے لیے قدم نہ اُٹھائے۔ انگریزی عورتیں ایسے شوہر کو پسند کرتی ہیں جو "جنٹلمین" ہو اور اربابِ دولت کے ہاں اپنی رسائی پیدا کر سکے۔ امریکن عورتیں ہر کس و ناکس سے شادی کو تیار رہتی ہیں وہ اس کی حیثیت اور مرتبے کو نہیں دیکھتی ہیں، چاہے وہ لُنجا، لنگڑا، بہرہ یا اندھا ہو بشرطے کہ وہ مال دار ہو۔[1]

ان اخبارات میں سے صرف "اخبارِ عالم" کی خبروں کا ذکر کروں گا۔ اس اخبار کی ۲۶ مئی سنہ ۱۸۷۰ء کی اشاعت میں سنبھل ہیرا ضلع مظفر نگر کے ایک شخص کا ذکر ہے جس کا نام میر دائم علی ہے۔ جس کی اس وقت ۱۱۵ سال کی عمر ہے۔ اس کی بصارت اور سماعت بالکل اچھی حالت میں ہے۔ خوب کھاتا پیتا ہے اور دس میل چل سکتا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہے کہ ان اخبارات میں کم از کم بعض مضمون اس لائق ہوتے ہیں جنھیں توجہ سے پڑھا جائے۔ مثلاً "اودھ اخبار" ۲۳ نومبر سنہ ۱۸۶۹ء میں ۱۲ کالموں کا ایک مضمون ہے جس میں ممالکِ متوسط کی جغرافی حالت کا بیان ہے۔

اس صوبے کی قسمتوں اور اضلاع کے متعلق مفصل معلومات درج ہیں۔ اس مضمون کا میرے سٹ گرد موسیو جی گارز نے، جو فاضل مستشرق ہیں، فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور یہ مضمون "مجلۂ تعلیمات" میں طبع ہوا ہے۔

---

[1] یہ ترجمہ فرانسیسی متن سے کیا گیا ہے۔ (مترجم)

ہندُستان میں تعلیم کی برابر روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ مہاراجا جے پور اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کی حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں اس مقصد کے لیے موصوف نے ریاست کے خرچ سے اپنی ریاست میں ۲۸۰ مدارس قائم کیے ہیں جن میں اس وقت کم وبیش ۸ ہزار طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔[1]

گزشتہ اکتوبر میں وائس رائے لارڈ میو نے اجمیر میں والیانِ ملک کا جو دربار منعقد کیا تھا اس موقع پر لارڈ موصوف نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ راجپوتانے کے اعلا خاندان کے بچّوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص کالج قائم کرنے والے ہیں۔ موصوف نے شرکاے دربار سے درخواست کی کہ سب والیانِ ملک اس خیال کی تکمیل کے لیے ان کے ساتھ تعاونِ عمل کریں۔[2]

تعلیمِ نسواں کی ترقی کی، بمبئی کے پارسی لوگوں نے بڑی حمایت کی ہے۔ اس تحریک کے حامیوں میں سے ایک ڈاکٹر برزرجی ہیں جو پچھلے دس سال سے انگلستان میں مقیم ہیں اور اب عنقریب اپنے وطن کو واپس جانے والے ہیں۔ موصوف کی والدہ اور دونوں صاحب زادیوں کا یہ ارادہ ہے کہ واپسی پر وہ بمبئی میں لڑکیوں کا ایک اسکول کھولیں جس میں دس یا اس سے زیادہ برس کی لڑکیاں تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس اسکول میں پوری تعلیم مغربی اصول پر دی جائے گی۔ لیکن اس کی بھی کوشش کی جائے گی کہ مشرقی آداب کی کسی طرح خلاف ورزی نہ ہو۔ خود ڈاکٹر صاحب اور اُن کے خاندان کی خواتین بلا معاوضہ تعلیم دیں گی۔ ڈاکٹر صاحب یہ

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۸ مارچ ۱۸۷۰ء

[2] انڈین میل مورخہ ۲۹ نومبر ۱۸۷۰ء

چاہتے ہیں کہ اس اسکول کے لیے لوگ چندے سے ان کی مدد کریں۔ ڈیوک آف آرگائیل وزیرِ ہند نے اس تجویز کو بہت پسند کیا ہی اور توقع کی جاتی ہی کہ صوبۂ بمبئی کے ناظمِ تعلیمات اس تجویز کو کام یاب بنانے میں ہر ممکنہ امداد کریں گے۔ اسکول کا انتظام ایک مقامی کمیٹی کے ہاتھ میں ہوگا۔[۱]

مس کارپنٹر ہندستان سے یورپ واپس آچکی ہیں۔ اس دفعہ انھوں نے پھر بہت کام کیا۔ موصوفہ بمبئی میں عورتوں کا نارمل اسکول قائم کرنے میں کام یاب ہوگئیں۔ سنہ ۱۸۶۹ء کے آخر میں اس اسکول میں تین پارسی اور بارہ ہندو لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اخبار "ہندو پرکاش" میں بھی اس انسانیت پرست خاتون کی تعریف کی گئی ہی اور لکھا ہی کہ موصوفہ نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے گڑگانو میں ایک ماڈل اسکول قائم کیا ہی جس کی افتتاحی رسم گزشتہ فروری کی ۲۲ تاریخ کو منائی گئی۔ مس کارپنٹر کے کاموں کی سندھ میں بہت شہرت ہی۔ وہاں کے بہت سے باشندوں نے موصوفہ کو ایک ایڈرس مع تحائف بھجوایا ہی تاکہ اپنی شکر گزاری کا اظہار کریں۔[۲]

کپتان ہول رائڈ ناظمِ تعلیمات پنجاب نے اپنی سالانہ رپوٹ کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہی۔ اس میں صوبۂ پنجاب اور اس کے ملحقات کی تعلیمی حالت پر تبصرہ ہی۔ اس رپوٹ کو پڑھنے سے نہایت آسانی سے تعلیمی ترقی کا پورا حال معلوم ہوجاتا ہی۔ ہمارے خیال میں حکومت نے اس باب میں جو نتائج حاصل کیے ہیں، وہ قابلِ اطمینان ہیں۔

---

[۱] علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۷۰ء

[۲] انڈین میل مورخہ ۱ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء

ئیں مشن کالجوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا اس لیے کہ ان کے متعلق ئیں بارہا ذکر کر چکا ہوں۔ اس وقت لکھنؤ کے مارٹینیر مشن کا ذکر کروں گا جس کا بانی لیون Lyon کا ایک فرانسیسی گزرا ہے۔ اس سال اس ادارے کو جاسف وال کے انتقال کے باعث بہت بڑا نقصان ہوا جو ۱۸۵۹ء سے برابر دیسی شعبے کے صدر تھے۔ ان کی اُردو، ہندی اور فارسی کی قابلیت مسلم تھی اور لکھنؤ بھر میں ان کی شہرت تھی۔ اس کالج کے پرنسپل مسٹر شلنگ ان کی اس خاص قابلیت کے باعث ان پر خاص توجہ فرماتے تھے۔

بنارس کے انگلیکن مشن کی ۱۳ ویں رپوٹ میں لڑکیوں کے نارمل اسکول کے متعلق گورمنٹ انسپکٹر کی رائے درج ہے۔ اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی مدرسہ ہے۔ گورمنٹ انسپکٹر نے لکھا ہے کہ دوسرے مدارس کے لیے اس کو بہ طورِ نمونہ پیش کرسکتے ہیں۔ اس اسکول کے چار درجوں میں چالیس طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ایک بچوں کا مدرسہ بھی ہے تاکہ نارمل اسکول کی طالبات وہاں تعلیمی مشق کرسکیں۔ انسپکٹر نے طالبات کے خط، ان کی ہندی اور اُردو پڑھنے کی مشق اور ترجمے کی قابلیت کی اچھی طرح جانچ کی اور یورپ کے نقشے پر ان سے سوالات دریافت کیے۔ نقشے کے متعلق ان کی معلومات نہایت قابلِ اطمینان تھیں جیسی کہ انگلستان کے اس قسم کے مدارس کی طالبات میں آپ کو ملیں گی۔ موصوف نے اپنی رپوٹ میں لکھا ہے کہ "ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کے نارمل اسکول قائم کر دیے جائیں اور وہاں کی فارغ التحصیل

۱؎ انڈین میل مورخہ ۶ دسمبر ۱۸۷۰ء

طالبات کو گانووں کے اسکولوں کا صدر بنا دیا جائے تو اس ملک میں عورتوں کی تعلیم کا مستقبل نہایت درخشاں ہو سکتا ہی"[1]

ہندستان کے مشہور فاضل سید احمد خاں کو اس بات کی بڑی تمنا ہی کہ ان کے ہم مذہب لوگ جدید تہذیب و تمدّن سے فیض یاب ہوں۔ موصوف نے حال میں حکومت کے اصولِ تعلیم پر اعتراض کیا ہی جو ملک میں رائج ہی۔ اس باب میں سید عبداللہ ان کے ہم نوا ہیں۔ چناں چہ یہ اعتراضات ایک رسالے کی شکل میں جس کا نام "موجودہ طریقِ تعلیم پر اعتراضات" ہی، شایع ہو چکے ہیں[2] موصوف کا خیال ہی کہ موجودہ تعلیم حد سے زیادہ یورپین مذاق کی ہی۔ سید احمد خاں نے اس بات پر احتجاج کیا ہی کہ حکومت نے اب تک لاہور میں "اورنیٹل یونی ورسٹی" قائم کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا، اس کام کو آگے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس رسالے کا بابو شیو پرشاد نے جواب دیا ہی اور بالکل مخالفانہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہی۔ بابو صاحب کے رسالے کا نام "اعتراضات پر اعتراضات" ہی[3] بابو صاحب مروجہ طریقِ تعلیم کے دل دادہ ہیں۔ اس قسم کا اختلافِ آرا بالکل قدرتی ہی اس لیے کہ سید احمد خاں مسلمان ہیں اور بابو صاحب ہندو ہیں۔ مسلمان عالِم اور ہندو عالِم کے اختلاف کی بس وہی نوعیت ہی جو اُردو اور ہندی کے اختلاف کی ہی۔ بابو صاحب اپنے استدلال میں اس پامال فقرے کو بہت جگہ دُہراتے ہیں کہ "ہندو لوگ آٹھ صدی تک مسلمانوں کی حکومت کے

---

[1] انڈین میل، مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۷۰ء
[2] Strictures upon the present system of Government
[3] Stricturesupon Strictures

مظالم برداشت کر چکے ہیں، بابو صاحب نے محمود غزنوی کی بربریت کو ظاہر کیا ہو لیکن اس کی اصلی وجہ غالباً یہ نہیں ہو کہ اس نے سوم ناتھ کے مندر میں ناپاک لنگم کی مورتی کو اوندھا کر دیا تھا بلکہ کچھ اور ہی۔

اگر کوئی ہندو اسلامی حکومت کو برا کہے اور انگریزی نظم ونسق کا مداح ہو تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن عربی، فارسی اور اردو جیسی زبانوں کے خلاف تعصب برتنا کسی طرح بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بابو شیو پرشاد جیسے عالم فاضل شخص سے مجھے اس کی توقع نہ تھی اس واسطے ان کی تحریر دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ بابو صاحب خود اردو نہایت عمدہ لکھتے ہیں اور متعدد تصانیف اس زبان میں شائع کر چکے ہیں۔ یہ خواہش کرنا کہ ہندستان میں سوائے سنسکرت، ہندی اور انگریزی کے اور کسی زبان کی تحصیل ہی نہ کی جائے میرے خیال میں تنگ نظری پر دلالت کرتا ہی۔ میں سید احمد خاں کی طرح اس باب میں زیادہ وسیع مشرب واقع ہوا ہوں۔

میں سید احمد خاں جیسے مشہور ومعروف مسلمان عالم کی حمایت میں اور کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ سید صاحب موصوف خود ان اعتراضات کی مطلق کوئی پروا نہیں کرتے۔ چناں چہ انھوں نے "علی گڑھ اخبار" کے مدیر سے کہہ دیا ہو کہ ان پر اگر اس قسم کے آیندہ اعتراضات ہوں تو انھیں مطلع کیا جائے لیکن ان کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ مجھے اردو زبان اور مسلمانوں کے ساتھ جو لگاؤ ہی وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان لوگ باوجود قرآن کو کتابِ الٰہی ماننے کے انجیلِ مقدس کی الہامی تعلیم سے انکار نہیں کرتے حالاں کہ ہندو لوگ بت پرست ہونے کے باعث انجیل کی تعلیم کو کبھی تسلیم نہیں

کرسکتے۔

اگرچہ سید احمد خاں موجودہ طریقِ تعلیم کے دل دادہ نہیں ہیں لیکن باوجود اس کے یورپ میں سائنس اور دوسرے علوم میں جو ترقی ہوئی ہی اس کے بڑے مداح ہیں۔ موصوف کا خیال ہی کہ یورپ کی ترقی عربوں کے زمانے کی ترقی سے بہت آگے بڑھ گئی ہی جن کے علوم ہی پر اہلِ یورپ نے اپنی سائنس کی بنیاد رکھی ہی۔ سید صاحب نے اپنے ان خیالات کو "علی گڑھ اخبار" میں پیش کیا ہی اور اپنے ان ہم مذہبوں کی ذہنیت پر افسوس ظاہر کیا ہی جو تنگ نظری کے باعث وسیع الخیال لوگوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔

سید صاحب اپنے ہم مذہبوں کو خود اسلام کی خاطر اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلیں جن کی شہرت کو زمانہ اب تک نہیں مٹا سکا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ قرآن و حدیث کو ترک کر دیں۔ خود سید صاحب پکّے "مسلمان" ہیں۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہی کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کریں۔ سید صاحب اہلِ یورپ کو کافر سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہلِ یورپ اپنے علوم و فنون کے سبب سے اس زمانے کے مسلمانوں کے مقابلے میں بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں اور ان کا عام چلن باوقار اور قابلِ تعریف ہی۔ چناں چہ سید صاحب نے اپنے ہم وطنوں کو اس کی دعوت دی ہی کہ وہ خود انگلستان آئیں اور اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے وہاں بھیجیں جیسا کہ خود انھوں نے کیا ہی[1]۔

---

[1] سید صاحب کے ایک بیٹے جن کا نام سید محمود ہی آج کل کیمبرج یونی ورسٹی کے کرائسٹ کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

یورپ اور ہندستان کی موجودہ حالت میں اس قدر فرق ہو کہ ثانی الذکر کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ یورپ کے قدم بہ قدم چلے۔ سید صاحب کو یقین ہو کہ بغیر یورپ کی تقلید کے ہندستان میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اب تک جو ہوا سو ہوا لیکن آیندہ کے لیے انھوں نے یہی لائحہ عمل تجویز کیا ہو۔

سید صاحب کی نصیحتوں کا اثر لوگوں پر آہستہ آہستہ پڑ رہا ہو۔ چناں چہ کلکتے کے ایک نوجوان مسلمان کے متعلق میں نے سنا ہو جو کچھ مہینے ہوئے تعلیم کی غرض سے لندن آئے ہیں۔ ان کا نام سید امیر علی ہو۔ ان کا تعلق ایک نہایت اعلیٰ خاندان سے ہو۔ موصوف نے کلکتہ یونی ورسٹی میں اپنی تعلیم کی تکمیل نہایت امتیاز کے ساتھ کی ہو جس کی وجہ سے حکومت نے ان کو وظیفہ عطا کیا۔ لندن میں تقریباً پچاس ہندستانی نوجوان تعلیم کی غرض سے آج کل موجود ہیں جو اپنے وطن واپس ہونے پر سرکاری عہدوں پر مامور کیے جائیں گے۔ میں نے سنا ہو کہ دہلی کے معزز خاندانوں کے بعض نوجوان اسی غرض کے لیے لندن آرہے ہیں۔ آج کل وہ ہندستان میں اس کی تیاری کے لیے اپنی تعلیم ختم کر رہے ہیں تاکہ لندن میں ان کا قیام مفید ہو سکے[1]۔ وہ مسلمان نوجوان جن کو اعلا تعلیم کا شوق ہو۔ سفرِ یورپ اور لندن کے قیام کے اخراجات کے متعلق سید احمد خاں سے برابر معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں تاکہ انھیں اپنے وسائل سے زیادہ اخراجات نہ برداشت کرنے پڑیں۔ میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ حکومت ان نوجوانوں کے

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۸ فروری ۱۸۷۰ء

لیے لندن میں ایک مکان مخصوص کر دے جہاں وہ اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جائیں۔ اور حکومت کو یہ بھی چاہیے کہ وہ ہندستان میں والدین کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں۔

اس وقت جو مسلمان لندن آتے ہیں ان کی رہبری سیّد عبداللہ کرتے ہیں جو نہایت دل چسپ اور پُر مذاق آدمی ہیں۔ ان کی بدولت مسلمان نوجوانوں کو انگریزوں کی عمدہ سوسائٹی میں ملنے جُلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ "پردیسیوں کا گھر" Strangers home میں جس کے سرپرست لارڈ کو لمونڈے ہیں اور بعض دوسرے بارسوخ یوروپین ایشیائی اس کے انتظام میں حصہ لیتے ہیں، بلا کسی تخصیص کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو وہ تمام سہولتیں بہم پہنچ جاتی ہیں جن کی اس قسم کے ادارے سے توقع کی جا سکتی ہے۔[1]

مجھے پوری توقع ہے کہ لاہور کی "اورنیٹل یونی ورسٹی" کے قائم کرنے میں حکومت زیادہ لیت و لعل نہ کرے گی اور ۱۸۷۱ء میں اس کا کام شروع ہو جائے گا۔[2] اس یونی ورسٹی کے متعلق اہلِ ہند برابر کئی سال سے مطالبہ کر رہے ہیں تاکہ تمام طلبہ کو کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے نصابِ تعلیم کی پابندی نہ کرنی پڑے جو بالکل مغربی طرز کا ہے۔ اس یونی ورسٹی میں

---

[1] اس کا پتا West India Dock Road, Lune House London ہے۔

[2] حکومت اس پر تیار ہے کہ اس یونی ورسٹی کے لیے جس قدر رقم چندے سے جمع ہوگی اتنی ہی رقم حکومت بھی دے گی اور اکیس ہزار سالانہ دیا کرے گی۔ علی گڑھ اخبار ۷ جنوری ۱۸۷۰ء

انگریزی زبان میں تعلیم نہیں دی جائے گی بلکہ غالباً ہندوؤں کے لیے ہندی اور مسلمانوں کے لیے اُردو میں تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے گا۔ سر ولیم میور نے یہ طے کر لیا ہے کہ الہ آباد میں دیسی زبان کا مدرسہ قائم کریں۔ اس کے لیے جگہ کا انتخاب ہو گیا ہے۔ جس جگہ امریکن مشن ہے جس میں ریورنڈ واش، اون اور سائر کام کرتے ہیں، وہیں اس مدرسے کی عمارت بنائی جائے گی۔ سر ولیم میور کے پیشِ نظر جو منصوبہ ہے اس کی تکمیل یقینی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لیے راجا وزیا نگرم نے ایک لاکھ رُپے کی رقم بہ طورِ عطیہ دی ہے اور دوسرے امرا بھی اس کام میں مدد کر رہے ہیں۔[1] سر ولیم نے حکومتِ ہند سے پانچ ہزار رُپے عمارت کے لیے طلب کیے ہیں۔ اس مدرسے میں مغربی علوم کی اعلا تعلیم دیسی زبانوں میں دی جائے گی۔ لیکن کلکتہ یونی ورسٹی کی سنڈیکیٹ اس تجویز کی مخالفت کر رہی ہے لیکن اس پر سنڈیکیٹ بھی آمادہ معلوم ہوتی ہے کہ یونی ورسٹی میں داخلے کے امتحان میں اس مدرسے کے امیدواروں کو اجازت دی جائے کہ وہ مختلف مضامین میں بہ جائے انگریزی کے ہندی یا اُردو میں جواب دیں۔[2]

ہندستانیوں کی عادت ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر نام و نمود بہت چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سی سماجی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نمود کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنی جاگیروں کو جو انھیں اپنے بزرگوں سے پہنچی ہیں، فروخت کر ڈالتے ہیں۔ کبھی وہ اس قدر قرض لے لیتے ہیں جسے کبھی ادا نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ ۴ فروری ۱۸۷۰ء [2] انڈین میل، مورخہ ۵ نومبر ۱۸۶۹ء

اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے ہیں تاکہ بعد میں اخراجات سے زیر بار نہ ہوں۔ اسی وجہ سے والدین اپنے لڑکوں کے لیے لڑکیاں خریدتے ہیں اور اسی وجہ سے لڑکیوں کو بھگا لے جانے کی رسم پائی جاتی ہے۔ اب ایک انجمن قائم کی گئی ہے جو ان سماجی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ اس کا اجلاس راجا بنارس کے محل میں بہ تاریخ ۲۱ مارچ ۱۸۶۹ء منعقد ہوا تھا۔ صوبۂ شمال مغربی (یو۔پی) کے لفٹنٹ گورنر، ناظمِ تعلیمات اور دوسرے اعلا انگریز عہدے داروں نے اس جلسے میں شرکت کی۔ اس جلسے میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بلا امتیازِ مذہب شرکت کی۔ اس انجمن کے ارکان کا مقصد یہ ہے کہ ہندستانی سماج کے اِس بہتے ہوئے ناسور کو اچھا کرنے کی تدابیر تجویز کریں۔ اور دوسروں کے علاوہ مہاراجا وزیا نگرم، بابو شیو پرشاد، مولوی فریدالدین اور پیارے لعل اس انجمن کے جلسوں کی صدارت کر چکے ہیں۔ ان سبھوں نے انجمن کے مقاصد سے گہری دل چسپی کا اظہار کیا ہے اور بڑی حد تک اس بات میں کام یاب ہوئے ہیں کہ اپنے اہلِ وطن کو عاداتِ قبیحہ کے ترک کرنے پر آمادہ کریں۔

اس جلسے میں سب سے پہلے ایک ہندو نے جو اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں تقریر کی جس میں یہ تجویز پیش کی کہ مختلف ذاتوں کے لیے شادی کے اخراجات کے متعلق قانون منظور کرانا چاہیے جس کی تمام ہندوؤں کو پابندی لازمی ہوگی۔ اس طرح سے ان قبیح رسوم کا انسداد ممکن ہوگا جن کے نقصانات ساری دنیا پر آشکارا ہیں۔ اس کے بعد سر ولیم میور نے جو اس انجمن کے سرپرست کی حیثیت رکھتے ہیں، ہندستانی زبان میں تقریر کی اور کہا کہ حکومت کو چاہیے کہ ان لوگوں کو نہایت سخت

سزائیں دے جو لڑکیوں کے قتل کے مُرتکب ہوتے ہیں۔ موصوف نے یقین دلایا ہو کہ وہ اپنے صوبے میں اس بُری رسم کے انسداد کی پوری کوشش کریں گے۔ حکومت کو چاہیے کہ بچّوں کی خرید و فروخت کے خلاف بھی سخت کارروائی کرے اس لیے کہ حکومت کے فرائض میں یہ شامل ہو۔ سر ولیم میور نے یہ بھی فرمایا کہ شادی بیاہ میں جو فضول خرچیاں کی جاتی ہیں اس کا انسداد خود ہندُستانیوں کو کرنا چاہیے اور اس کے لیے وہ جو چاہیں طریقے اختیار کریں۔ حکومت اس باب میں ان کے ساتھ انتہائی ہم دردی کرے گی۔

ہمارے خیال میں ہندو فلسفہ یا بُت پرستی کی رسوم سے ان قباحتوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضرورت ہو کہ مسیحی مبلغین کی مساعی کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ ہندستان میں مسیحی اخلاق کی ترویج ہو جس کی بِنا عقیدت ہو۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہو کہ مسیحی مبلغین اپنے کام میں جوش کے ساتھ منہمک ہیں۔ بہ قول سینٹ پیٹر کے ان کے نزدیک حضرت مسیح کی ذات ہی سے کلیسا کی مقدس عمارت کی بنیاد قائم ہو۔ مسیحی مبلغین غفلت شعار اہلِ ہند کو "پیرس والی دعا" کے الفاظ میں یوں خطاب کرتے ہیں: "اے بدنصیب لوگو! ان گونگے بہرے خداؤں کی پرستش چھوڑ دو۔ کیا تمھارے آنکھیں نہیں کہ یہ دیکھو۔ خدا کے مقدس شہر کے دروازے تمھارے استقبال کے لیے کھُلے ہوتے ہیں۔ تم ادھر آؤ۔"

آہستہ آہستہ اہلِ ہند پر ان الفاظ کا اثر ہو رہا ہو۔ ان کے بُت خانے جہاں ہزاروں خداؤں کی پرستش کی جاتی ہو مسمار ہو رہے ہیں اور باوقار عقلِ انسانی فتح حاصل کر رہی ہو۔ ابھی صرف پچاس برس ہوئے

ہیں کہ انگریز مبلّغین نے ہندستان میں اپنا کام شروع کیا۔ اس عرصے میں ۷۸ ہزار اہلِ ہند انگلیکن کلیسا میں شامل ہو چکے ہیں۔ جن ہندستانیوں نے عیسائی مذہب قبول کیا ہی ان میں بعض نہایت مشہور لوگ شامل ہیں جیسے کلکتے کے بنرجی اور نیمیا، جبل پور کے صفدر علی، دہلی کے رام چندر اور تاراچندر، امرتسر کے عبد اللہ عماد الدین، پشاور کے دلاور خاں وغیرہ گوتندر موہن ٹیگور بھی جو کلکتے کے رہنے والے ہیں اور آج کل انگلستان میں ہیں، مسیحی حلقے میں شامل ہو گئے ہیں[1] ان کے علاوہ اور بھی ہیں جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا ہی، جن میں بعض مصنّف ہیں اور جن کی نسبت میں اپنے خطبوں میں ذکر کر چکا ہوں۔ مقامِ ٹینولی ریورنڈ ڈاکٹر کالڈول نے اونچی ذات کے دو برہمنوں (میاں اور بیوی) کو بپتسما دیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو دڑاوڑی زبانوں کے ساتھ خاص شغف ہی[2] بہ قول شاعر ورڈس ورتھ کے "بپتسما کے پانی پر محبّتِ الٰہی کا سایہ ہوتا ہی اس سے روحِ انسانی کو نئی زندگی ملتی ہی جو عطیۂ ربّانی ہی!"

کلکتے کے اسقف ریورنڈ ملین حسبِ معمول نہایت جوش و انہماک سے اپنا کام کر رہے ہیں، گزشتہ مارچ کے مہینے میں موصوف جزیرۂ انڈمان گئے تھے جہاں نیم وحشی اور مردم خور آبادی رہتی ہی۔ وہاں انھوں نے دو کلیسا قائم کیے اور انگلیکن طریقے کے مطابق بپتسمے کی رسوم ادا کیں۔ وہاں

---

[1] مجھے افسوس ہی کہ اس مشہور ہندستانی سے میں پیرس میں ملاقات نہ کر سکا۔ ان کے متعلق مجھے ریورنڈ جیمس لانگ نے اطلاع دی تھی۔ ثانی الذکر وہی صاحب ہیں جن کا میں نے اپنے ۱۸۶۹ء کے خطبے میں ذکر کیا ہی۔

[2] دیکھو فروری ۱۸۷۰ء کا The Church missionary intelligencer

کے انگریزوں، یورشینوں اور ہندستانیوں نے ان کا استقبال کیا۔ وہاں سے موصوف برما گئے اور رنگون میں جہاز سے اُترے جہاں مسٹر ایچ نے عیسائیوں کا ایک نیا فرقہ بنایا ہے جس کو وہ "نئی روشنی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کے متعلق انھوں نے ایک کتاب میں اصولوں کی توضیح کی ہے۔ برما کے دارالسلطنت مانڈلے میں موصوف نے وہاں کے عیسائیوں کے قبرستان میں جا کر مغفرت کی دعائیں پڑھیں[1] اس کے بعد موصوف کوچین روانہ ہوئے جہاں انھیں ۱۷ اکتوبر کو پہنچنا ہے۔

ہندستان میں اس وقت کلیسائی عہدے داروں میں ہندستانی لوگ بھی ہیں۔ چناں چہ مدراس کے عیسائی حلقے میں ۱۹۰ عہدے داروں میں سے ۷۹ ہندستانی ہیں۔ صرف گزشتہ سال اسقف نے ۲۴ دیسی پادریوں کا تقرر کیا۔ گزشتہ تین سالوں میں مدراس کے کلیسائی حلقے میں ۷ ہزار ہندستانیوں نے مسیحی مذہب قبول کیا۔[2]

کلکتے کے کلیسائی عہدے داروں نے دیسی عیسائیوں کی تعلیم کے لیے لاہور میں ایک مذہبی مدرسہ قائم کیا ہے جہاں مبلّغین کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ یہاں تعلیم اُردو زبان میں دی جائے گی۔ ان مبلّغین کے لیے لاطینی زبان سیکھنا لازمی ہوگا۔ کیتھولک لوگوں میں دستور ہے[3] اگر کوئی کیتھولک مبلّغ مذہب لاطینی زبان سے واقف

---

[1] انڈین میل: مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۷۰ء

[2] دیکھو Colonial Church Chronicle مورخہ جولائی ۱۸۷۰ء اور انڈین میل مورخہ ۳ مئی ۱۸۷۰ء

[3] Colonial Church Chronicle مورخہ دیکھو فروری ۱۸۷۰ء

نہ ہو تو وہ اپنے عُہدے سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک میں وہیں کی زبان عبادت کے لیے استعمال کی جائے۔ یہ درست ہے کہ یورپ میں ابھی تک لاطینی زبان کا سیکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے اگرچہ ایک زمانہ وہ تھا جب کہ لاطینی عام طور پر یورپ کے طول و عرض میں سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ایسے ممالک میں جو لاطینی زبان سے بالکل اجنبیت رکھتے ہیں وہاں اس کا استعمال بے سود ہے۔ کلیسا کی زندگی کی ابتدائی صدیوں میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ چناں چہ یونانی، قبطی، حبشی، عربی، عبرانی، کلدانی، ارمنی اور سلافی زبانوں میں مسیحی تعلیم و اشاعت کا کام کیا جاتا تھا اور بہ جائے لاطینی کے ان کی زبانوں میں عبادت کی جاتی تھی۔ ان ممالک میں اب بھی مقامی زبانوں میں عبادت ہوتی ہے حالاں کہ ان میں سے بعض کا تعلق روما سے ہے۔ خدا کو یہ تنوع پسند ہے۔ کلیسا کا لباس، سلیمان کی بیوی کی طرح ایک طرح کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس میں مختلف رنگوں کی جھلک اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ہندُستانی زبان و ادب ۱۸۷۱ء میں

پچھلے سال، جو فرانس کے لیے انتہائی نامردی کا ثابت ہوا، ہندستان برابر ترقی کے راستے پر گام زن رہا۔ حقیقت یہ ہی کہ اس کا قدم بہ نسبت بیش تر کے زیادہ مستعدی سے اُٹھ رہا ہی۔ مَیں اس سال کے تبصرے میں اس ترقی کا ذکر کروں گا۔ مَیں یہاں یہ دُہرانا نہیں چاہتا کہ اُردُو زبان نشو و نما پا رہی ہی اور اُس کی وسعت بڑھتی جاتی ہی اور نہ اس موقع پر اس جھگڑے کا تفصیلی ذکر کروں گا جو اُردُو اور ہندی میں کچھ عرصے سے پیدا ہو گیا ہی۔ ہندی وہ بولی ہی جو اُردُو سے پہلے سے موجود ہی اور اب بھی اس کے ساتھ موجود ہی۔

سُورت کے ایک ہندُو عالم نے جن کا نام گنپت رام ہی اور جو اپنے دوسرے اکثر ہم مذہبوں کے خلاف تعصب سے پاک ہیں اور محبِ وطن ہیں، ابھی حال میں ایک خط شایع کیا ہی جس میں تمام ہندستان کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت واضح کی ہی اور بتایا ہی کہ اس مقصد کے لیے ہنُدستانی سے زیادہ موزُوں اور کوئی زبان نہیں ہی۔ مسلمانوں کی ہندستان کی فتوحات کے بعد اس زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش ہو گئی ہی[1]۔ موصوف اس خط میں لکھتے ہیں کہ "دیوناگری خط میں جو

---

[1] ہندستانی زبان کے الفاظ تمام ایشیا میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ دیومن دروِلی نے لکھا ہی کہ تونگا تابو Tonga-Tabou (بحرِ اوقیانوس میں ایک جزیرہ) میں قومی جشنوں کو "ناچی" کہتے ہیں جو لفظ ناچ کا بگڑا ہوا ہی۔ ان موقعوں پر ناچ گانا ہوتا ہی۔

ہندی میں استعمال ہوتا ہی فارسی رسم خط کے مقابلے میں ہندستانی زبان کے لیے زیادہ موزوں ہی۔ یہ خط سیّد احمد خاں کے نام ہی اور ۲۶ مئی ۱۸۷۱ء کے علی گڑھ اخبار میں شایع ہوا ہی۔

گنپت رام نے اپنے خط میں اس بات کا اظہار کیا ہی کہ دوسرے ملکوں کے خلاف جن میں ایک زبان بولی جاتی ہی، ہندستان مشترک زبان کے فوائد سے محروم ہی۔ ہندُستان میں عام طور پر صوبہ جاتی زبانیں بولی جاتی ہیں اور کچھ عرصے سے انگریزی زبان نے ملک پر دھاوا کر دیا ہی۔ لیکن اب ان مختلف صوبوں میں رسل ورسائل کے سلسلے عام طور پر قائم ہو گئے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں یہ سہولت موجود نہیں تھی جب کہ ہر صوبہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا اور دہلی کا اقتدارِ اعلا محض اخلاقی حیثیت رکھتا تھا۔ مختلف صوبوں کے ہندستانیوں کے لیے اگر وہ اُردو نہیں بولتے تو آپس میں ایک دوسرے کا مطلب سمجھنا بہت دشوار ہوتا ہی اس لیے کہ ان کی بولیاں بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ حکومت کے انگریزی ملازموں کا جب ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبادلہ ہو جاتا ہی تو انھیں بالکل نئی زبان سیکھنی پڑتی ہی۔

یہ بات یقینی ہی کہ ہندستان میں اگر ایک مشترک زبان رائج ہو جائے تو اس سے ملک کی فلاح و بہبود کی ضمانت ہو گی اور ملک کو ترقی حاصل ہو گی جس کے لیے بہت سے مخلص لوگ کوشاں ہیں۔ گنپت رام نے اپنے خط میں یہ تجویز پیش کی ہی کہ ہر صوبے میں اس خاص مقصد کے لیے ایک مجلس بنائی جائے اور اس خیال کو عام کرنے کے لیے کوبلی مجالس بنائی جائیں۔ ہندستانی زبان کا ایک رسالہ دیوناگری خط

میں اس مقصد کی نشر واشاعت کے لیے جاری کرنا چاہیے تاکہ اس کے ذریعے سے سارے ہندُستان میں اس زبان کو رائج کرنے کا کام لیا جائے۔ پھر دوسری زبانوں کے اخبار نویسوں کو آمادہ کرنا چاہیے کہ ہندُستانی زبان میں اپنے اخبارات ورسائل کو شایع کریں اور سوائے اس کے اور کوئی زبان نہ استعمال کریں۔ اسی طرح ہندُستانی زبان میں کتابیں تالیف وتصنیف ہونی چاہییں۔ ظاہر ہے کہ یہ اصلاحی کام ایک دم سے نہیں کیا جا سکتا۔ آہستہ آہستہ صبر واستقلال کے ساتھ ہندستانی زبان سارے ملک میں پھیل سکتی ہے۔

اس کے ساتھ حکومت سے درخواست کرنی چاہیے کہ سوائے ہندستانی زبان کے اور کسی دوسری زبان کو کالجوں اور اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے اور اسی زبان میں نصابی کتابیں شایع کی جائیں۔ بلاشبہہ حکومت خوشی سے اس تجویز کو منظور کر لے گی۔

ممکن ہے اس پر لوگ آمادہ نہ ہوں کہ سارے ہندستان میں سوائے ہندُستانی کے اور کوئی زبان بولی ہی نہ جائے لیکن یقیناً اس پر سب راضی ہو جائیں گے کہ ہندستانی کی تعلیم سارے ملک میں عام کی جائے تاکہ ہر شخص تھوڑا بہت اس زبان میں گفتگو کر سکے اور ایک مشترک رسمِ خط کی وجہ سے کُل ملک کے پڑھے لکھے لوگوں میں باہمی تبادلۂ خیالات ممکن ہو سکے۔

اِس ضمن میں ہندستانی پر نظرِ انتخاب اس لیے پڑتی ہے کہ بہت زمانے سے یہی زبان کُل ملک میں پھیلی ہوتی ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ اس کا استعمال اور وسیع کیا جائے اور اس کو سارے ہندستان

کی سرکاری اور ادبی زبان بنایا جائے جس طرح کہ اب بھی ایک حصّہ ملک کی وہ ادبی اور سرکاری زبان ہی۔ بعض لوگ یہ کام انگریزی زبان سے لینا چاہتے ہیں لیکن ہمیں اندیشہ ہی کہ یہ زبان ہندستانیوں کے لیے اس درجہ اجنبی ہی کہ وہ کبھی بھی عام زبان نہیں بن سکتی۔ گنپت رام اور اس کے اکثر ہم وطن بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان اسی خیال کی حمایت میں ہیں۔ انگریزی بہت عرصے تک ذریعۂ تعلیم بھی نہیں رہ سکتی جیسا کہ سیّد عبداللہ اور کرنل نسو لیز نے دوسرے مستند ہندستانی لوگوں کی طرح صاف صاف کہا ہی۔ یہ بات مسلّم ہی کہ ہندستان کی تمام زبانوں میں ہندستانی بہ اعتبار اپنی نزاکت اور خوبی کے اور دوسری زبانوں پر فوقیت رکھتی ہی۔ بابو گنپت رام نے اپنے ہم مذہبوں کی خاطر جو یہ خیال پیش کیا ہی کہ دیوناگری رسم خط کو فارسی رسمِ خط پر ترجیح دینی چاہیے تو مَیں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ مَیں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ اس کے وجوہ مَیں پہلے بھی متعدد مرتبہ بیان کر چکا ہوں۔ اصطلاحات کے متعلق بھی بابو صاحب کہتے ہیں کہ "اگر سہولت ہو تو عربی زبان سے انھیں مستعار لیا جائے" لیکن وہ سنسکرت الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں۔

ظاہر ہی کہ اس صورت میں ضروری ہوگا کہ ہندستانی زبان کو وسیع کیا جائے اور بہتر بنایا جائے اور اس میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں جس طرح کہ پچھلے چالیس سال سے آج کل کے یونانی اپنی زبان کے متعلق کر رہے ہیں۔ اس طرح ہندستانی زبان کی سطح بھی بلند کی جا سکتی ہی اور دنیا کی وقیع زبانوں کے پہلو بہ پہلو یہ اپنا مرتبہ حاصل کر سکتی ہی۔

یہ اعتراض کیا جا رہا ہے کہ اگر ہندستانی زبان کو کُل ملک کے لیے اختیار کیا گیا تو صوبہ جاتی زبانوں کی طرف عام طور پر بے توجہی برتی جائے گی۔ لیکن ہماری رائے میں اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ جو قومی فائدہ حاصل ہوگا وہ زیادہ اہم ہوگا۔ پھر اگر مقامی زبانوں میں کوئی تصنیف واقعی دل چسپ اور مفید ہوگی تو کوئی امر مانع نہیں کہ لوگ اسے اصلی حالت میں نہ پڑھیں۔[1]

مسٹر جی بیرز نے جو ایک فاضل شخص ہیں اور میرے خطبوں میں شریک رہے ہیں، مجھے اس بات کا پورا یقین دلایا ہے کہ انھوں نے ہندستانی زبان کا ہندستان کی موجودہ زبانوں نیز مُردہ زبانوں سے مقابلہ کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندستانی ہی اس کی مستحق ہے کہ اسے ہندستان کی تاریخی زبان کہا جا سکے۔ صرف و نحو کے اعتبار سے بہ نسبت دوسری زبانوں کے یہ سنسکرت سے قریب تر ہے۔ پھر مختلف زمانوں میں اس کے الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے ہم تاریخِ ہند کے مختلف عہدوں اور ان تغیرات کا جو رُونما ہوئے سُراغ لگا سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے ہندستانی زبان میں بہ درجۂ اتم یہ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ہندستان کی وسیع برطانوی سلطنت کی مستقل ادبی زبان قرار دی جائے۔

بمبئی کے ریورنڈ براؤن کر نے جنھیں اپنے ان سفرناموں کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی ہے جو ہندستان اور انگلستان کے رسائل میں شایع ہو چکے ہیں، حال میں اپنے ایک خط میں میرے سنہ ۱۸۷۰ء کے مضمون کے متعلق لکھتے ہوئے یوں کہا ہے: "میں اس امر کا اعتراف

---

[1] علی گڑھ اخبار، مورخہ ۱۶ جون سنہ ۱۸۷۱ء

کرتا ہوں کہ ہندستان کے ہر حصے میں اُردو زبان نہایت مفید ثابت ہوتی ہو۔ میں نے راس کماری سے ہمالیہ تک اور گنگا کے دہانے سے لے کر دریائے انڈس تک ہر جگہ یہ بات محسوس کی۔"

انگلستان میں بھی ہندستانی کی اہمیت کا لوگوں کو احساس ہو رہا ہو چناں چہ لندن کے یونی ورسٹی کالج کی مجلسِ رفقا میں یہ فیصلہ ہوا ہو کہ ہندستانی زبان کی جو چیر قائم کی گئی ہو اس پر فوراً کسی کا تقرر ہونا چاہیے۔ چناں چہ حال میں قاضی شہاب الدین ابراہیم کا اس خدمت پر تقرر عمل میں آیا ہو جو "ایسٹ انڈیا ایسو سی ایشن" کے معتمدِ اعزازی ہیں اور عرصے تک کوٹہ کے راجا کے وزیر رہ چکے ہیں اور اب بھی راجا کے مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موصوف کو ہندستان کی قومی زبان پر پورا عبور حاصل ہو اور ان کی قابلیت کی عام طور پر شہرت ہو۔[1]

آج کل اس مسئلے پر انگلستان میں سنجیدگی کے ساتھ غور ہو رہا ہو کہ لندن میں ایک ایسا کالج قائم کیا جائے جہاں خاص طور پر ہندستانی سول سروس کے لیے طلبہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ یہ نیا کالج ہیلی بری کے کالج کا قائم مقام ہوگا جس کے بند ہونے پر مستشرقین نے سخت رنج و افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اب بھی ایک کالج ایسا موجود ہو جہاں ہندستانی سول سروس کے طلبہ کی تعلیم ہوتی ہو اور جہاں ہندستان کی زبانوں میں صرف ہندستانی لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہو۔

پنجاب یونی ورسٹی کی مجلسِ رفقا میں یہ فیصلہ ہوا ہو کہ سائنس پر اُردو زبان میں جو بہترین رسالہ لکھے گا اسے سالانہ یونی ورسٹی کی جانب

---

[1] انڈین میل، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۷۰ء

سے انعام دیا جائے گا اس لیے کہ اُردو نہ کہ ہندی، شمالی ہند کی زبان ہی۔ ہندی بہ نسبت اُردو کے کم استعمال کی جاتی ہی۔ نیز یہ کہ اُردو میں دوسری زبانوں کے مستعار لیے ہوئے خیالات کی ترجمانی کرنے کی بہتر صلاحیت موجود ہی اس میں دوسری زبانوں کے مستعار لیے ہوئے خیالات اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں اور اگر ان خیالات کے ادا کرنے کے لیے محاورے موجود نہ ہوں تو آسانی کے ساتھ بنائے جا سکتے ہیں۔ بابو نوین چندر رائے نے اس خیال سے مجلسِ رفقا میں اختلاف کیا اور وہی دلائل پیش کیے جو ہندی کے حامی اکثر پیش کیا کرتے ہیں اور جن کے جواب میرے خیال میں نہایت تشفی بخش طریقے پر بارہا دیے جا چکے ہیں[۱]۔ چوں کہ بابو صاحب ہندو ہیں اس لیے انھوں نے مذہبی حیثیت سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہی۔ ہم یورپین لوگ اس قسم کے مسائل پر زیادہ بے تعصبی اور غیر جانب داری سے رائے قائم کر سکتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہی میں پنجاب یونی ورسٹی کی مجلسِ رفقا کے فیصلے کو خوشی سے تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔

۱۸۷۰ء کی تعلیمات کی سرکاری رپوٹ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ نئے قواعد کے مطابق اودھ کے تمام اضلاع کے مدارس میں طلبہ کو اُردو پڑھائی جاتی ہی اس لیے کہ تجربے سے یہ پتا چلا کہ بہ نسبت ہندی (ناگری رسمِ خط) کے زیادہ مفید اور مقبول خیال کی جاتی ہی۔ رپوٹ نگار نے لکھا ہی کہ دیسی علما اس بات پر متفق ہیں کہ اُردو زبان کے طرزِ نگارش اور انشا میں اس وقت تک لطف پیدا نہیں ہو سکتا

---

[۱] بابو صاحب نے اس ضمن میں ایک خاص لسانی تقسیم پیش کی ہی۔ وہ ہندستانی کو اُردو اور ہندی دونوں سے علاحدہ ایک زبان تصور کرتے ہیں جو دونوں پر حاوی ہی۔ ویسے علاحدہ طور پر ہندی ہندووں کی ہی اور اُردو مسلمانوں کی۔

جب تک کہ عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔

صوبۂ متوسط میں جہاں قدیم قبائل کثرت سے آباد ہیں ہندی بہ مقابلہ اُردو کے زیادہ استعمال کی جاتی ہی۔ اس صوبے کی عدالتوں میں بھی ہندی استعمال ہوتی ہی اور مدارس میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کی تعلیم کا انتظام ہی۔ یہاں بہ نسبت ہندی کے اُردو کم طالب علم پڑھتے ہیں[1]۔

مستشرقین کے لیے مشرقی زبانوں کو جب لاطینی رسمِ خط میں لکھا جاتے تو اکثر مغالطہ ہوجاتا ہی اس لیے کہ لاطینی رسمِ خط میں ایک ہی لفظ کو مختلف اشخاص مختلف طریقوں پر لکھتے ہیں۔ چناں چہ حکومتِ ہند نے بھی یہ دشواری محسوس کی اور جیسا کہ مَیں پہلے بتلا چکا ہوں یہ فیصلہ ہوا ہی کہ لاطینی رسمِ خط میں سرکاری طور پر جو اَعلام لکھے جائیں، ان میں یکسانیت ہونی چاہیے اور اسی طرح انگریزی الفاظ یا اَعلام جب اُردو میں لکھے جائیں تو ان میں یکسانیت ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ جس کا جس طرح جی چاہے لکھے۔ پنجاب کے ناظمِ تعلیمات مسٹر ہالرائڈ نے اس مقصد کے حصول کے لیے قواعد وضع کیے ہیں جن میں انگریزی تلفّظ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہی جو تحریر سے مختلف ہوتا ہی[2]۔

ہندستان کے تین کروڑ مسلمان اُردو کے فروغ کے لیے کوشاں

---

[1] ہندی پڑھنے والوں کی تعداد ۴۷ ہزار ہی اور اُردو پڑھنے والوں کی تعداد ۳ ہزار ہی۔ (رپوٹ تعلیمات صوبۂ متوسط بابت ۱۸۶۹ء۔ ۱۸۷۰ء ص ۱۳)

[2] ملاحظہ ہو:-

A Scheme for writing English words in the Persian charater. مطبوعہ لاہور ۱۸۶۱ء

ہیں اور ہندوؤں کی مخالفت کا اچھی طرح مقابلہ کر رہے ہیں۔ انھیں یہ بات یاد ہی کہ انھوں نے ہندستان پر چھ صدی تک حکومت کی ہی اور اس لیے انھیں یہ حق حاصل ہی کہ وہ انگریزوں سے جنھوں نے ان کی جگہ لی ہی، انصاف کی توقع رکھیں۔ اس لیے اور بھی وہ انگریزوں سے لحاظ کی توقع رکھتے ہیں کہ انھوں نے انگریزی حکومت کے ساتھ وفاداری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ مسلمانوں کو اس کا اعتراف ہی کہ انگریزی حکومت ان کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتی لیکن بہ قول کرنل نسولیز قدیم صدرِ کلیہ اسلامی کلکتہ، مسلمانوں کو اس بات کا ملال ضرور ہی کہ حکومت کے بعض قوانین سے انھیں نقصان پہنچا ہی جنھیں وہ خلافِ انصاف تصور کرتے ہیں مثلاً ان جاگیروں کی ضبطی جو مغل شہنشاہوں سے نسلاً بعد نسلٍ انھیں منتقل ہوئی تھیں، ان مسلمانوں کے وارث کے حق کو تسلیم کرنا جنھوں نے مذہب بدل دیا ہو، قاضیوں کو ان کے شرعی حقوق سے محروم کرنا، وقف کو مذہبی اغراض کے علاوہ دوسرے کاموں میں استعمال کرنے کی اجازت اور مسلمانوں کے بہ جائے سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کا مامور ہونا جس کی وجہ سے وہ انگریزی تعلیم سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں اور اگر سرکاری عہدوں کی توقع ان میں باقی رہتی تو وہ خود بہ خود تعلیم کی طرف رغبت کرتے۔ مسلمانوں کی ان شکایات کو بہ قول کرنل نسولیز دور کیا جا سکتا ہی۔ کرنل موصوف نے ان مسائل کے متعلق جو بحث کی ہی وہ ہندی مسلمانوں کے حامیوں کو ضرور پڑھنی چاہیے[1] بعض سر برآوردہ مسلمانوں نے اپنی متذکرہ بالا شکایات

---

[1] ٹائمز مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۷۱ء

"ہندستان میں معاشری ترقی کی امداد کی انجمن" کے ایک جلسے میں جو گزشتہ نومبر (لندن) میں منعقد ہوا تھا پیش کی ہیں[۱]۔

مذہب اسلام تمام ہندستان میں پھیلا ہوا ہے۔ ملک کے ہر گوشے میں آپ کو مساجد نظر آئیں گی۔ آج بھی مسیحی مذہب کے مقابلے میں اسلام کی ترقی ہندستان میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ چین اور افریقہ میں جن شیرخوار بچوں کو اُن کے ظالم والدین لاوارث چھوڑ دیتے ہیں، انھیں دریا دل مسلمان مبلغ اپنے مذہب کے آغوش میں پناہ دیتے ہیں۔ ان بے کس شیرخوار بچوں کی جان بچانے کے لیے اسلامی مبلغوں کی دیکھا دیکھی مسیحی مبلغین نے بھی انتظام کیا ہے۔ نالنسی کے لاٹ پادری 'فوربین جانسون' کی خاص توجہ کے باعث اب مسیحی مبلغین کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ شمالی چین میں مسلمانوں نے چین کی شہنشاہی سے آزاد خودمختار ریاستیں قائم کرلی ہیں۔

ملاکا، جاوا، بورنیو اور اس مجمع الجزائر کے دوسرے ٹاپوؤں میں اسلام کو خوب فروغ ہو رہا ہے۔ ان جزائر میں ہندوؤں کے قدیم مندر بھی نظر آتے ہیں لیکن وہ سب عرصے سے نہایت شکستہ حالت میں ہیں۔ ان مندروں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندوں نے بُت پرستی ترک کردی ہے جو ان کے باپ دادا کا مذہب تھا اور وہ اس حقیقی خدا کی پرستش کرنے لگے ہیں جس کی انجیلِ مقدس اور توریت میں تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں مضائقہ نہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں نہ کہ عیسائی، اس واسطے کہ قرآن بجائے خود انجیلِ مقدس اور توریت کی تعلیم کو اپنے

---

[۱] Allen's Indian Mail مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۱ء

مخصوص افسانوی رنگ میں پیش کرتا ہی۔

یہ سچ ہے کہ اکثر مسلمان اپنے مذہب کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے مذہبی احکام کی پوری پیروی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ وہ تبلیغ کا کام اچھا کر سکتے ہیں۔ بہت سے ایسے ممتاز مسلمانوں کے حالات ہم تک پہنچتے ہیں جن کی نیکی اور فیاضی میں مسیحیت کی جھلک نظر آتی ہی۔ بہادر لیکن بدقسمت ٹیپو سُلطان کی اولاد میں ایک آخری شخص باقی رہ گئے ہیں وہ اسی قسم کے لوگوں میں ہیں، ان کا نام غلام محمدؐ ہی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے لگ بھگ ہی۔ گزشتہ فروری کی ۱۷ تاریخ کو لارڈ میو وائس رائے ہند نے انھیں، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔ شہزادہ غلام محمد نے شجاعت کی بجائے فیاضی اور سخاوت سے نام پیدا کیا ہی۔ دراصل دانش مند لوگوں کے نزدیک یہ صورت زیادہ قابلِ ترجیح ہی[۱] اس قسم کے مسلمان جو عیسائیوں کی طرح نیک زندگی بسر کرتے ہیں قابلِ احترام ہیں۔ ویلز کے مشہور واعظ جے' رابرٹ سن' نے یوحنا باب ۱۔ سطر ۹ کی عبارت کی جو تشریح اپنے وعظ میں کی ہی وہ ایسے لوگوں پر صادق آتی ہی۔ وہ عبارت یہ ہی: "وہ حقیقی روشنی ہی جو ہر شخص کے دل کو روشن کرتی ہی جو دنیا میں آتا ہی"۔ جے رابرٹ سن اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں: "اگر کوئی شخص اپنے دل میں پاکیزہ خیال

---

[۱] شہزادہ غلام محمد نے کلکتے کے غربا کے لیے ایک لاکھ ۶۵ ہزار رُپے کی رقم وقف کردی تھی۔ بعد میں اس میں ایک لاکھ کا اور اضافہ کیا گیا۔ موصوف نے غریب عیسائیوں کی امداد کے لیے بھی ایک لاکھ کی رقم وقف کی ہی۔ (انڈین میل ۲۸ مارچ ۱۸۷۱ء اور ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۱ء)

کو جگہ دیتا ہی یا نیکی اور شرافت کو اپنے عمل میں سموتا ہی تو ہمیں زیبا نہیں کہ ان اوصاف سے چشم پوشی کریں اور انھیں ظاہرداری پر محمول کریں بلکہ ہمیں چاہیے کہ جس شخص سے جیسے اعمال صادر ہوں انھیں ان کی فطری حالت میں دیکھیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوش ہونا چاہیے کہ بعض اوقات نہایت تاریک گوشوں میں بھی اس روشنی کی جھلک ہمیں نظر آجاتی ہی جو سرچشمۂ عدل کا آفتاب ہی۔"

ڈبلو براؤن کیر نے جن کی نسبت میں ابھی ذکر کرچکا ہوں، بمبئی کے ایک اخبار "اورلینڈ اسٹار آف انڈیا" Overland Star of India مورخہ ۱۱ر فروری ۱۸۷۰ء اپنے بیجاپور کے سفر کا ایک واقعہ بیان کیا ہی جو قابلِ ذکر ہی۔ بیجاپور دکن میں عادل شاہیوں کا دارالسلطنت رہ چکا ہی۔ موصوف بیان کرتے ہیں کہ انھیں اس سفر میں معلوم ہوا کہ مسلمان آدمی خدا کے نام کی کس قدر عزت کرتا ہی۔ موصوف نے اتفاق سے جب کہ وہ اس شہر کے آثار دیکھنے گئے ایک پرانی توپ پر اپنا پانو رکھ دیا۔ اتفاق سے اُنھوں نے جہاں پانو رکھا تھا اس کے نیچے لفظ "اللہ" نہایت خوب صورت ایرانی خط میں کندہ تھا۔ موصوف توپ پر اس لیے دونوں پیر رکھ کر کھڑے ہوئے تھے تاکہ قُرب وجوار کا منظر اچھی طرح دیکھ سکیں۔ ان کے ساتھ جو شخص قدیم آثار کے متعلق وضاحت کر رہا تھا، وہ مسلمان تھا۔ اس نے فوراً صاحب موصوف کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ان کے پیر کے نیچے "اللہ" کا نام کندہ ہی جس کی بے حرمتی ہو رہی ہی۔ جب صاحب موصوف نے اپنے پیر وہاں سے ہٹا لیے تو اس شخص نے نہایت خوش اعتقادی اور احترام کے جذبات کے ساتھ

اس جگہ کو اچھی طرح صاف کیا۔

اگرچہ میں مسلمانوں کا طرف دار ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب درحقیقت مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے جیساکہ مون پلیئے Mont Pcilli=i کے مشہور سوال وجواب میں مذکور ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت ملال ہوتا ہے کہ بعض عیسائی لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں اور حقیقت کو چھوڑ کر گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ انھیں شرم آنی چاہیئے کہ وہ ایسا کرتے ہیں۔ ایک انگریز رابرٹ گرین نے جو برمنگھم کا باشندہ ہے اور اس کا باپ ۱۸۵۷ء کے غدر میں باغیوں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اس سال کے شروع میں بمبئی میں دین اسلام قبول کر لیا۔ اسلامی روایات کے مطابق اس نے اپنا نام بھی بدل ڈالا اور اب اپنا نام عبداللہ رکھا ہے[۱]۔ ایک نہایت معزز نوجوان انگریز خاتون مس ڈونلی نے حال ہی میں لکھنؤ میں اسلام قبول کر لیا اور ایک انگریز خاتون مس چارلوٹ ہل بھی حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئی ہیں اور اب وہ مسز غلام قادر ہیں۔ مجھے یہ پوری توقع ہے کہ مسلمان لوگ سورۂ فاتحہ میں جو دعا مانگتے ہیں "اھدنا الصراط المستقیم" وہ بارگاہِ رب العزت میں ضرور قبول ہو گی اور یہ پوری جماعت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بجائے ہمارے رہبر صادق حضرت مسیح ابنِ مریم کی ہدایت قبول کرے گی[۲]۔[۳]

قسطنطنیہ کے سلطان کو سنّی مسلمان اپنا خلیفہ مانتے ہیں، نہ صرف

---

[۱] انڈین میل، مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۷۱ء

[۲] انڈین میل، مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۸۷۱ء

[۳] گارساں دتاسی کٹر عیسائی تھا اس لیے تعجب نہیں کہ اس قسم کی توقعات نے اس کے دل و دماغ میں راہ پائی۔ (مترجم)

رُوحانی اعتبار سے بلکہ دنیادی نقطۂ نظر سے بھی۔ چناں چہ "تونس" کے حاکم صادق پاشا نے خلیفۃ المسلمین کے اقتدار کو کھلم کھلا تسلیم کیا ہی۔ خلیفۃ المسلمین نے صادق پاشا کے بیٹے کو ان کا جانشین قرار دے دیا ہی۔ خلیفۃ المسلمین کی بھی یہی خواہش ہی کہ وہ نہ صرف عالمِ اسلامی کے رُوحانی پیشوا بلکہ دنیادی مقتدر بھی تسلیم کیے جائیں۔ لیکن مصر والے خلیفہ کے اقتدار کو دل سے نہیں مانتے۔ سلطانِ قسطنطنیہ کے خلاف جال میں وہابیوں نے جو شورش اٹھائی تھی اس میں انھیں کام یابی نہیں ہوئی۔ سلطان نے ان کے خلاف جنگ کی اور انھیں زیر کر لیا۔ وہابیوں کے متعلق یہ بات عام طور پر معلوم ہی کہ وہ مذہب اسلام کو آلائشوں سے پاک اصلی شکل میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں ہم پروٹسٹنٹوں یا پیوریٹنوں سے مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ خوش عقیدہ مسلمانوں میں جو لوگ مذہبی آزادخیالی کی طرف مائل ہیں، وہ وہابیت کا کچھ نہ کچھ رجحان ضرور رکھتے ہیں۔ یا کم از کم وہابیوں کو بُرا نہیں سمجھتے مثال کے طور پر میں سیّد احمد خاں کا نام پیش کر سکتا ہوں جن کا اتفاق سے وہی نام ہی جو ہندی وہابیت کے بانی کا تھا۔[۱]

ہندستان کی انگریزی حکومت کی نظر میں وہابی باغی تصوّر کیے جاتے ہیں، لیکن ایسا سمجھنا بڑی غلطی ہی۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہی کہ بعض اشخاص نے جو اپنے کو وہابی کہتے تھے حکومتِ ہند کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے خلاف جہاد کا فتویٰ لگے

---

[۱] ملاحظہ ہو میری کتاب "ہندستانی ادب کی تاریخ" جلد ۳۔ صفحہ ۲۳ (اس باب میں سیّد احمد خاں کا ذکر ہی

کے علما سے حاصل کیا۔[۱] لیکن جہاد تو اس وقت جائز ہو سکتا ہی جب کہ اسلام کی عظمت اس سے قائم ہوتی ہو اور کام یابی کی توقع ہو۔ سید احمد خاں نے کلکتے کی "اسلامی انجمن" کی رائے کے مطابق اس فتوے کی اصلیت کے متعلق "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۷۱ء میں نہایت مدلل بحث کی ہی۔ یہ مضمون بہ طور ایک خط کے شایع ہوا ہی۔ موصوف کا خیال ہو کہ اسلامی مملکت کسی دوسری مملکت کے خلاف اس وقت جہاد کر سکتی ہو جب کہ اس کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو اور وہاں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے جاننے والے آباد ہوں یا جہاد اُس وقت فرض ہوتا ہی جب کہ کسی غیر مسلم مملکت میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہوں اور وہ اپنے مذہبی احکام کی پیروی نہ کر سکتے ہوں۔ اگر اس غیر مسلم مملکت میں مسلمانوں کو اس کا یقین ہو کہ اگر وہ بغاوت کریں گے تو کام یابی یقینی ہی، ایسی حالت میں جہاد جائز ہو گا۔ ان کی بغاوت ہی دراصل جہاد تصور ہو گی۔ لیکن مسلمانانِ ہند کے حالات بالکل دوسرے ہیں۔ باوجود مکی علما کے فتوے کے ان پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کریں اس لیے کہ حکومت ان کے مذہبی معاملات میں مطلق کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرتی اور اس باب میں انھیں پوری آزادی دے رکھی ہی۔ فی الحقیقت ہندستان کو بجائے دارالحرب کے

---

[۱] ملاحظہ ہو میری کتاب "ہندستانی ادب کی تاریخ" دوسرا ایڈیشن۔ ص ۲۰۴۔ مسٹر ہنٹر نے اپنے رسالے "مسلمانانِ ہند" میں اس فتوے کو نقل کیا ہی۔ یہ رسالہ مسلمانوں کے خلاف لکھا گیا ہی جس کا جواب سید احمد خاں نے "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۲۴ نومبر و یکم دسمبر میں دیا ہی۔

دار السلام کہنا چاہیے۔
وہابیوں کا اصل مقصد موجودہ مسلمانوں کے عقائد اور رسوم میں اصلاح کرنا ہے۔ جہاد کے متعلق ان کے بھی وہی عقائد ہیں جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں۔ سید احمد خاں نے اصولِ جہاد کی نسبت جو مثالیں پیش کی ہیں ان سے یہ حقیقت اچھی طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ سید صاحب نے اپنے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم میں سوائے ایک کے اور دوسرے وہابیوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ نیز یہ کہ وہابی اصول کسی طرح بھی حکومتِ وقت کے خلاف نہیں ہیں۔ سید صاحب نے وہابیوں کی جو حمایت کی ہے اس سے کٹر مسلمانوں اور حکومت دونوں کو ناخوش کرنے کا اندیشہ ہے۔ لیکن معتدل خیال لوگوں کو دشواری ہمیشہ پیش آیا کرتی ہے اور انتہا پسندوں کا انھیں نشانۂ ملامت بننا پڑتا ہے۔ سید صاحب نے اس باب میں جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے وہ عین دانش مندی اور معقولیت پر مبنی ہے۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں امبالہ اور سرہند کے قریب اور بالخصوص سیتان کی نوآبادی میں جسے مشہور مصلح سید احمد نے آباد کیا تھا، انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ مشتعل ہو گئی۔ یہ شورش وہابیوں کی طرف منسوب کی جاتی ہے جنھیں ایک مُلّا نے جو جہاد کی تلقین کرتا پھرتا تھا، آمادۂ بغاوت کر دیا۔ یہ بھی مشہور کر دیا گیا کہ وہابی لوگ انگریزی حکومت کا خاتمہ کر کے مغلیہ سلطنت کو پھر سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض لوگوں نے مساجد اور مدارس میں اپنے وعظوں کے ذریعے مسلمانوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کرنے کی پوری

کوشش کی لیکن حکومت کو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے مخالفوں کے وسائل بہت محدود ہیں اور وہ اس کو کوئی شدید نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اس قسم کی تحریکوں کو ۱۸۵۷ء کی سپاہیوں کی بغاوت کے مماثل نہیں سمجھنا چاہیے۔ بہ قولِ سعدیؒ:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

۱۸۷۱ء میں ہندستانی زبان کی متعدد کتب شایع ہوئی ہیں۔ پنجاب میں سرکاری طور پر ہندی اور اردو کی مطبوعات کی جو فہرست شایع ہوا کرتی ہے اس سے مجھے ان کتابوں کا حال معلوم ہوا۔ کپتان ہولرائڈ کی مہربانی اور توجہ کی بدولت مجھے یہ فہرست دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ موصوف اہلِ ہند کی تعلیم کے لیے عرصے سے کوشاں ہیں۔ مَیں پہلے ہندی کتابوں کے متعلق ذکر کرتا ہوں۔

رجبندر کی دان لیلا۔ یہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ سداما اور پرمانند کی نظموں کے مجموعے کا بھی یہی نام ہے۔

موہن کی سینا لیلا۔ یہ بھی نظموں کا مجموعہ ہے۔ کمار داس اور سداما کی نظموں کے مجموعے کے بھی یہی نام ہیں۔

سبھوراؤ کی رکمنی منگل۔ بشن داس کی تصنیف کا بھی یہی نام ہے جس کی نسبت مَیں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی اور ہندستانی کی تاریخ" میں ذکر کیا ہے۔ (جلد ۳۔ ص ۵۲)

چرن داس کی نوس کیتو۔ اس میں نوس کیتو کے قصے کو نظم کیا گیا ہے جو گرد پران سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب دہلی میں چھپی ہے۔

سیوا اپشن پن جلی۔ یہ اشعار کا انتخاب ہے جو بابو کالی چرن نے سیوا

کے متعلق جمع کیا ہو۔ بابو صاحب نے ہندی میں اور دوسری کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

سونے لوہے کا جھگڑا۔ اس میں سونے اور لوہے کی بحث کا حال ہو۔ یہ کتاب دہلی میں ۱۸۷۰ء میں چھپی ہو۔

اس ضمن میں "نجنین باگ" کا ذکر کر دوں جو پستن جی بہرامجی والا کی تصنیف ہو اور بمبئی میں ۱۸۷۰ء میں چھپی ہو۔ یہ کتاب گجراتی رسم خط میں ہو اور ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہو دوسری کتاب "راجا گوپی چند اکھیان" ہو جو رستم ایرانی کی لکھی ہوئی ہو۔ یہ بھی بمبئی میں چھپی ہو اور گجراتی رسم خط میں ہو اور ۸۶ صفحات پر مشتمل ہو[1] اس کتاب میں اجین کے ایک راجا کا قصہ بیان کیا گیا ہو جس نے راج پاٹ چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی تھی۔ اس مضمون کو اور دوسرے مصنفوں نے بھی بیان کیا ہو۔ جے وتت نے ہندی میں (دیکھو میری کتاب "ادب ہندی اور ہندستانی ... کی تاریخ"۔ جلد ص ۶۹) اور امبو پرشاد نے اُردو میں اسی مضمون پر کتابیں لکھی ہیں۔ آخرالذکر کی کتاب دہلی میں چھپی ہو۔

یجروید کے ہندی ترجمے کا اعلان کیا گیا ہو۔ ترجمے کا نام "ویدارتھ پرادیپ" رکھا گیا ہو۔ اس کا پہلا حصہ علی گڑھ میں چھپا ہو جس کو بیسم کے راجا گوری پرشاد سنگھ نے کلکتے کی ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے پیش کیا ہو۔ اس کا بھی اعلان کیا گیا ہو کہ اتھروید کا اصل متن شایع کیا جائے گا

---

[1] جس طرح پانڈی چری میں ہندستانی کو تامل کے رسم خط میں اور بنگال میں بنگالی کے رسم خط میں لکھتے ہیں اسی طرح بمبئی پریسی ڈنسی میں اکثر اوقات ہندستانی گجراتی رسم خط میں لکھی جاتی ہو اور سندھ میں سندھی رسم خط میں۔

اور بین السطور اُردو ترجمہ ہوگا۔[1] اس کا ایک نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے لیکن مجھے اس کا علم نہیں کہ یہ کتاب شایع ہوئی یا نہیں۔

بنارس کے ریورنڈ ڈبلو ایتھرنگٹن نے اہلِ ہند کے لیے ہندی زبان کی صرف و نحو پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کی نسبت میں گزشتہ سال ذکر کرچکا ہوں۔ موصوف نے اسی مضمون پر ہندی میں ایک اور کتاب "بھاشا بھاسکر" کے نام سے لکھی ہے۔ صوبۂ شمال مغربی کے ناظمِ تعلیمات نے اس کتاب کی قدر افزائی کی ہے اور اسے اپنے مدارس کے نصاب میں شامل کرلیا ہے۔ اس مسیحی مبلغ کے لیے یہ بات موجبِ فخر ہونی چاہیے کہ وہ اہلِ ہند کے لیے سلیس ہندی زبان میں یہ کتاب لکھنے کے قابل ہوا۔ ہندی کی صرف و نحو پر ایک اور کتاب حال میں شایع ہوئی ہے جس کی مشہور مستشرق مسٹر فٹز ایڈورڈ ہال نے بہت تعریف کی ہے۔ اس کتاب کا نام "بھاشا تتوابودھنی" ہے۔ سیتل پرشاد گپت کی ہندی صرف و نحو کی کتاب "شبد پرکاش" بھی قابلِ ذکر ہے۔

ہندی زبان کے مشہور مصنف بابو ہری چندر نے جو "کاوی بچن سُدھا" کے ایڈیٹر ہیں، ۱۸۷۰ء - ۱۸۷۱ء میں بنارس میں بھارت چندر کے بنگالی ناٹک کا ہندی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا نام "ودیا سندر ناٹک" ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ہندی کے "شکنتلا ناٹک" کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ اسے بھی نصیب ہوگی۔ "شکنتلا ناٹک" کے قلیل عرصے میں متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ میں اس کا پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ بابو صاحب کا ارادہ ہے کہ سنسکرت زبان کے مشہور ناٹکوں کا ہندی میں ترجمہ شایع کریں۔ بابو ہری چندر کی دوسری کتاب "اگر والا کی اُت پتی" کے شایع ہونے کا

---

[1] اخبارِ عالم۔ مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۷۱ء

بھی اعلان کیا گیا ہی۔ یہ کتاب ہندی میں ویش ذات کے متعلق ہی۔ کہا جاتا ہی کہ "اگر والا" کے نام کی بنا شہر "اگروہا" سے پڑی ہی جو دہلی کے مغرب میں واقع ہی۔ لیکن میرے خیال میں اس نام سے پتا چلتا ہی کہ اس ذات کے لوگ پہلے آگرے سے آئے تھے۔ بابو ہری چندر نے اعلان کیا ہی کہ وہ اُس مصنف کو ۸۰۰ رُپے بطورِ انعام پیش کریں گے جو فرانس و جرمنی کی گزشتہ جنگ کی تاریخ ہندی زبان میں سب سے اچھی لکھے گا۔

نواب محمد مردان علی خان نواب جد پور نے ایک جنتری شائع کی ہی جو ایک سو ایک سال تک مفید ہو سکتی ہی۔ اس کا ایک نسخہ نواب صاحب نے علی گڑھ کی مجلسِ ادبی کو نذر کیا ہی۔[1]

اُردو کتابوں میں سب سے پہلے "کلیاتِ ظفر" قابلِ ذکر ہی۔ یہ دہلی کے آخری تاج دار بہادر شاہِ ثانی المتخلص بہ ظفر کے کلام کا مجموعہ ہی۔ اس بادشاہ کو اپنے تخت و تاج سے ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کے بعد ہاتھ دھونا پڑا۔ اس بدقسمت بادشاہ کا حال مَیں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ" میں مفصل بیان کیا ہی۔ (جلد ۳۔ ص ۳۱۷ وغیرہ) مولوی غلام رسول نے قصۂ بلال نظم کیا ہی۔ اس نظم کی زبان پنجابی ہی اور وہ لاہور میں ۱۸۷۰ء میں طبع ہوئی ہی۔ دیوی دیال نے لیلیٰ مجنوں اور سسی پنوں کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہی۔ مولوی خلیل علی نے "داستانِ امیر حمزہ" کا فارسی سے اُردو میں ایک نیا ترجمہ کیا ہی۔ یہ ترجمہ ۱۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہی اور ایک جلد میں ہی۔ یہ کتاب فارسی میں اکبر بادشاہ کے حکم سے تالیف کی گئی تھی۔ اس کے لکھتے وقت مؤلف کے پیشِ نظر مہابھارت کا مضمون تھا۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۳ مارچ ۱۸۷۰ء

ہی کہ اکبر کے زمانے میں سنسکرت سے فارسی میں جو تراجم کیے گئے تھے وہ ہندی اصل پر مبنی تھے[1]

مرزا اعظم بیگ نے "تاریخِ گجرات" لکھی ہی جو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہی۔ یہ کتاب لاہور میں چھپی ہی۔ پنڈت کاشی ناتھ نے اپنی تصنیف "کتاب اخلاص کاشی" کا نام اپنے نام پر رکھا ہی۔ اس کتاب میں کہانیوں کے طور پر مفید باتیں بیان کی گئی ہیں۔ علی گڑھ اخبار میں اس کے متعلق متعدد بار ذکر نکل چکا ہی۔ اس کتاب کی اشاعت میں حکومت نے بھی مدد دی ہی اور مدارس کے لیے اس کے ایک ہزار نسخے خریدے ہیں۔

"تہذیب القلوب" اخلاق پر ایک کتاب ہی اور ۱۸۷۰ء میں دہلی میں چھپی ہی۔ یہ فارسی کتاب "مفرح القلوب" مصنفہ محمد ارزانی کا ترجمہ ہی اور ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ میں طبع ہوا ہی۔ فارسی میں سنسکرت کی کتاب "ہتوپدیش" سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ اردو ترجمہ ۴۷۴ صفحات پر مشتمل ہی[2]

"تحفۃ الاحبا فی تحریم النسا" مولوی قطب الدین دہلوی کی تصنیف ہی اور ۱۸۶۹ء میں لکھنؤ میں چھپی ہی۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب "تحفۃ الزوجین" دہلی میں دوسری مرتبہ طبع ہوئی ہی۔ اس کتاب میں زن و شوہر کے حقوق و فرائض پر بحث کی گئی ہی۔ مولوی قطب الدین دہلوی نے حال میں ایک کتاب اُن مسلمانوں کے لیے لکھی ہی جو مذہب کے پابند نہیں ہیں۔ اس کتاب کا نام "رسالۂ بے نمازاں" ہی۔

---

[1] H. Blochmann, Proceedings of the Asiatic Society Bengal, 1871, p. 142.

[2] دیکھو میری کتاب "ادبِ ہندی اور ہندستانی کی تاریخ" جلد ا۔ ص ۶۰۹

"اعتراض قرآن" میں رام چندر نے اسلامی عقائد پر تنقید کی ہے۔ شورشِ عظیم سے قبل رام چندر دہلی کالج میں پروفیسر تھے۔

"سراج القاری" میں قرآن کے لب ولہجہ اور تلفظ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی نسبت میں نے اپنی تصنیف "ادب ہندی و ہندستانی کی تاریخ" میں ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی زبان پنجابی ہے لیکن فارسی رسمِ خط میں ہے اور لاہور میں طبع ہوئی ہے۔

"کلمات الحق"۔ یہ نصرت علی کی اُردو نظم ہے اور ۱۸۷۰ء میں دہلی میں چھپی ہے۔ اس میں مشہور صوفی منصور کے سولی پر چڑھنے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ منصور کے حالاتِ زندگی کو حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات سے مشابہ بتلایا گیا ہے۔

"راہِ نجات"۔ اس کتاب کے مصنف کا نام غلام حسین ہے نہ کہ محمد علی جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ (جلد ۲۔ ص ۳۵۵)

"گوہرِ شب تاب"۔ پنڈت بانکے بہاری لال نے بعض انگریزی نظموں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۹ء میں لکھنؤ میں طبع ہوئی ہے۔ اس ترجمے کو دیکھتے ہوئے میں ڈاکٹر لیٹنر کی اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ مغربی زبانوں کی تصانیف کا لفظ بہ لفظ ہندستانی میں ترجمہ کرنے کے بجائے ان کے مطالب کو سلیس زبان میں ادا کرنا چاہیے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہندستانی لوگ ان تصانیف کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور ترجمہ کرنے والوں کو بھی سہولت ہوگی۔ انگریزی سے اُردو میں اچھا ترجمہ کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ ایسی تو نہیں ہیں کہ ان پر قابو

نہ پایا جا سکے جیسا کہ مولوی عظمت اللہ مظفر پوری نے "رسالۂ جلسۂ تہذیب" کی دسمبر ۱۸۷۰ء کی اشاعت میں بہ وضاحت بیان کیا ہے۔ لیکن نظم کا معاملہ دوسرا ہے۔ نظم ہمیشہ مبہم اور غیر واضح ہوا کرتی ہے جیسا کہ شیخ سعدی نے بوستان میں کہا ہے:۔

شیخ سعدی کے اس قول کے ضمن میں میں یہاں اس طرف اشارہ کر دوں جیسا کہ میں نے اپنے مضمون "مشرقی ادب پر ایک نظر" میں لکھا تھا کہ ایشیائی شاعر مظاہرِ فطرت کو ذہنی اور تمدنی اشیا سے اکثر تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ مثلاً ہندستان کا ایک مسلمان شاعر اپنے معشوق کے ہونٹوں کے رنگ کو گلاب کے رنگ کے مثل بتاتا ہے تو ہندو شاعر دریائے گنگا کی موجوں کو سبز مخمل پر جو گوٹ لگائی جاتی ہے اس سے تشبیہ دیتا ہے اور موجوں کی آواز کو ان برہمنوں کی گُنگناہٹ سے مشابہ قرار دیتا ہے جو گنگا کے کنارے وید کی مناجاتیں پڑھا کرتے ہیں۔

منشی نظام الدین نے ناصر الدین محمد بن الاحسن طوسی کی کتاب "اخلاق ناصری" کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ لاہور سے شایع ہوا ہے اور ۲۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام مصنف کے نام پر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ کہستان کے شہزادے کے نام پر رکھا گیا ہے جو مصنف کا ہم نام تھا اور اسی کے نام کتاب معنون کی گئی ہے۔ میں منشی نظام الدین کی دوسری تصانیف کے متعلق اپنی کتاب "ادبِ ہندی اور ہندستانی کی تاریخ" میں ذکر کر چکا ہوں۔

علی گڑھ کی اکاڈمی سائنس اور ادب کی ہندستان میں بڑی خدمت کر رہی ہے۔ اس کا رسالہ اور دوسری مطبوعات اور مباحثے نہایت مفید

ہوتے ہیں۔ اکاڈمی کی طرف سے اُردو میں لاہور کے ریوزنڈ ڈبلو، ڈکن سن، نے جو جغرافیہ لکھا تھا اس کی طباعت کا کام ختم ہوگیا۔ اس کا نام "مرآت غریب" رکھا گیا ہی۔ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہی۔

لاہور کے پروفیسر جی ڈبلو لیٹنر نے اپنی تصنیف "سنین الاسلام" شایع کر دی ہی جو ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہی۔ یہ اُردو میں اسلامی تاریخ اور ادب کا خلاصہ ہی۔ موصوف کو اس کتاب کی تیاری میں مولوی محمد حسین سے بہت مدد ملی۔ یہ اس بات کی ضمانت ہی کہ ہندستان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہی وہ بالکل صحیح ہی۔ اس کتاب کا طرزِ تحریر نہایت سلیس اور شستہ ہی جس کی اہلِ مشرق بڑی قدر کرتے ہیں اور جو اکثر ان کتابوں میں مفقود ہوتا ہی جو اہلِ یورپ ہندستان کے متعلق خود لکھتے ہیں یا دوسروں سے لکھواتے ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ جو مولوی عمادالدین نے پہلے مسیحی مذہب کے متعلق شایع کی تھیں، ابھی حال میں تین کتابیں اسی موضوع پر موصوف نے لکھی ہیں۔ مولوی عمادالدین پہلے مذہب اسلام کے "عماد" تھے تو اب مسیحی مذہب کے "عماد" ہیں۔ وہ اپنی تحریر اور تقریر سے مسیحی مذہب کی ہندستان میں بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ تین کتابیں یہ ہیں:-

(۱) اعجاز القرآن۔ یہ کتاب چھ حصّوں میں ہی۔ پہلے حصّے میں مصنّف نے اس مسئلے پر بحث کی ہی کہ آیا قرآن کو آسمانی کتاب کہ سکتے ہیں یا نہیں؟ دوسرے حصّے میں مولوی عمادالدین نے ثابت کیا ہی محمد (علیہ السلام) کا تمام تر استدلال یہود و نصاریٰ کی کتب سے ماخوذ ہی۔ تیسرے حصّے میں حضرت جبرئیل کے وحی لانے پر بحث کی ہی۔ چوتھے حصّے میں

حضرت جبرئیل کی ماہیت بیان کی گئی ہی۔ پانچویں حصّے میں اس واحد ذریعۂ نجات پر بحث کی گئی ہی جو خدا کا بتایا ہوا ہی۔ چھٹے حصّے میں سچی وحی کے ثبوت میں قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا ہی۔ آخر کے باب میں قرآن اور حدیث کی رُو سے ثابت کیا گیا ہی کہ قرآن مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق کوئی اعجازی کتاب نہیں ہی۔

(۲) تفسیر مکاشفات۔ یہ کتاب لاہور میں ۱۸۷۰ء میں شایع ہوئی ہی۔

(۳) آثارِ قیامت۔ اس کتاب میں قیامت کے روز مُردوں کے زندہ ہونے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہی۔ یہ کتاب بھی لاہور میں ۱۸۷۰ء میں شایع ہوئی ہی۔

شملے کے مسٹر پوٹروائن نے جو حکومتِ ہند کے محکمۂ امور خارجی میں مددگار معتمد ہیں، ایک ہزار رُپے کا انعام اس شخص کو دینے کا وعدہ کیا ہی جو میرے قدیم دوست مسٹر اے رگلمن کی کتاب "سماوات" کا بہترین ترجمہ ہندستانی زبان میں کرے گا۔ یہ اعلان ۳ر جولائی ۱۸۷۱ء کو شایع ہوا ہی۔ ترجمے ۱۳ر ستمبر ۱۸۷۲ء تک پہنچ جانے چاہییں۔ ان ترجموں کی جانچ کے لیے سر سیّد احمد کی صدارت میں ایک مجلس مقرر کی گئی ہی جو اس بات کا تصفیہ کرے گی کہ انعام کا کون مستحق قرار دیا جائے۔

کپتان ہولرائڈ کی تصانیف میں "قواعدِ اُردو" قابلِ ذکر ہی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ابھی حال میں شایع ہوا ہی اور اس کے ۲۵۰۰ نسخے طبع کیے گئے ہیں۔ کتاب ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہی۔ اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے میں ہندستانی زبان کی تاریخ پر بحث کی گئی ہی اور یہ بتایا گیا ہی کہ اس زبان میں کس قدر خوبیاں موجود ہیں اور اس کے لکھنے والوں

کے طرزِ تحریر میں کس قدر فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہو۔
ہندُستانی زبان کی جو دوسری کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں بعض پہیلیوں پر ہیں، بعض نظمیں ہیں؛ پرندوں کے حالات انگریزی سے خواجہ ضیاءُ الدین نے ترجمہ کیے ہیں؛ سقراط، افلاطون، ارسطو، بکن، نیوٹن، فارسی شاعر فردوسی اور سنسکرت کے شاعر والمیکی مصنف راماین کی سوانح عمریاں ہیں۔ (سر) سیّد احمد (خاں) نے دہلی کے آثارِ قدیمہ پر سلسلۂ مضامین لکھا ہو اور اسی طرح مصر کے اہرام اور چین کی دیوار اور چینیوں کے رسم ورواج پر بھی مضامین شایع ہوتے ہیں۔
اودھ کی تعلیمی ترقی بابت ۱۸۶۹ء۔ ۱۸۷۰ء کے متعلق جو رپوٹ شایع ہوئی ہو اس میں بعض نئی مطبوعات کا ذکر ہو جن کی نسبت مَیں یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔
"مفید الانشا"، منشی امین الدین نے خطوط نویسی کے اصول اس میں بیان کیے ہیں۔ پنڈت شیو نراین نے اس کتاب کو ہندی میں بھی شایع کیا ہو۔ مَیں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ" میں اس کتاب کے متعلق ذکر کیا ہو۔ (دیکھو جلد ۳۔ ص ۴۲۴)
"اشرف القوانین"۔ یہ سیّد ابوالفتح عرف مولوی اشرف علی کی لکھی ہوئی صرف ونحو کی کتاب ہو اور بمبئی میں چھپی ہو۔ سندھی زبان کی صرف ونحو پر ہندستانی میں منشی ادھارام نے ایک کتاب لکھی ہو۔ "دل پسند کہانیاں" بھی اسی مصنف کی لکھی ہوئی ہیں جو ہندستانی زبان میں ہیں۔ الومل تکھم داس نے ۱۸۷۱ء میں "مختصر تاریخ سندھ" ہندستانی زبان میں شایع کی ہو۔

اس وقت مَیں اس خبر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ الہ آباد کے ریورنڈ مسٹر بیٹ جو امریکی مسیحی مبلغ ہیں اور عالم فاضل شخص ہیں، ہندی کی ایک لغت تیار کر رہے ہیں جس میں ۲۷ ہزار لفظ ہوں گے۔ یعنی ٹامسن کی لغت کے مقابلے میں اس میں ۲۱ ہزار لفظ زائد ہوں گے [۵]

پٹنہ میں منشی سورج مل نے ڈاکٹر ایس۔ ڈبلو' فیلن' کے زیرِ نگرانی ایک اُردو لغت تیار کرنا شروع کیا ہو جس میں اُردو لفظوں کے معنی اُردو میں بیان کیے جائیں گے۔ یہ لغت فارسی رسمِ خط میں ہوگی اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہوگی۔ اس کی ۸ سائز کی تقطیع ہوگی اور ہر صفحے پر دو کالم ہوں گے۔ الفاظ کی ترتیب فارسی حروفِ تہجی کے لحاظ سے ہوگی۔ ہر لفظ کے ساتھ اس کا ماخذ بتایا جائے گا کہ آیا وہ عربی کا ہی، فارسی کا یا سنسکرت کا ہی۔ سنسکرت کے الفاظ کی اصل دیوناگری رسمِ خط میں لکھی جائے گی۔ اس لغت کے الفاظ کے ساتھ مشہور مصنفوں اور شاعروں کے کلام سے مثالیں بھی دی جائیں گی تاکہ ان کے معنی کا تعین ہو سکے۔ اس لغت کا اشتہار اس وقت میرے پیشِ نظر ہی جس کے ساتھ چار صفحات بہ طور نمونہ منسلک ہیں۔ ان صفحات کے دیکھنے سے مَیں نے یہ رائے قائم کی ہو کہ کام قابلِ اطمینان طریق پر ہوا ہی۔ میری خواہش ہو کہ یہ لغت جلد تیار ہو کر چھپ جائے۔

مَیں اس موقع پر خاص طور پر اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو اور ہندی میں سائنس پر ۱۸۷۱ء میں متعدد کتابیں شایع ہوئی ہیں اور بعض عنقریب شایع ہونے والی ہیں۔ ان میں سے بعض پٹنہ میں زیرِ طباعت ہیں۔ رائے سوہن لعل ناظم نارمل اسکول پٹنہ اور مسٹر فیلن کے

---

[۵] ٹائمز آف انڈیا، مورخہ ۲۷ مئی ۱۸۷۱ء

زیرِ نگرانی یہ کتابیں لکھوائی گئی ہیں۔ مسٹر فیلن نے ازراہِ کرم ان کتابوں کے نمونے جو مجھے بھیجے ہیں، انھیں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سائنٹی فک اصطلاحوں کو بجائے سنسکرت یا عربی کے ہندستانی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ بعض مصنف یہ کرتے ہیں کہ علمی اصطلاحوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیتے ہیں اور انھیں انگریزی رسمِ خط میں متن میں تحریر کر دیتے ہیں لیکن پٹنہ میں جو کتابیں شایع ہو رہی ہیں، ان میں یہ طریقہ نہیں اختیار کیا گیا۔ میں خود ہندستانی زبان میں اصطلاحات کے ترجمے کرنے کا قائل ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح مغربی علوم کا چرچا ہندُستان میں بڑھے گا اور سائنس کی معلومات سے لوگ آگاہ ہو سکیں گے۔ اس وقت اس قسم کی ۵۶ اصطلاحات میرے پیشِ نظر ہیں جو ہندستانی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

یورپ کی طرح ہندستان میں بھی قدیم رسائل واخبارات کے بند ہونے پر نئے نئے اخبار ورسائل جاری ہوتے ہیں۔ اس سال ہندستانی کے ۲۰ نئے اخبار ورسائل جاری ہوئے ہیں لیکن یہ سب کے سب روزانہ اخبار نہیں ہیں ان میں سے بیشتر ہفتے وار ہیں اور بعض دسویں دن نکلتے ہیں اور بعض مہینے میں دو مرتبہ۔ بنگلور کا "قاسم الاخبار" ہفتے میں دو مرتبہ شایع ہوا کرتا تھا لیکن اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ "اودھ اخبار" نے بھی اعلان کیا ہے کہ اگست ۱۸۷۱ء سے اس کی اشاعت ہفتے میں دو مرتبہ ہو گی۔ اس اخبار کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ شروع میں یہ صرف چار صفحات پر ہوتا تھا اور اب اس میں ۲۴ صفحے ہوتے ہیں۔ یہ خبر کہ یہ اخبار ہفتے میں دو مرتبہ شایع ہوا کرے گا ہندستانیوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ہندستانی زبان سے شغف رکھتے ہیں، باعثِ مسرت ہے

صرف صوبۂ شمال مغربی میں اس وقت ۲۳ اخبار دیسی زبانوں میں نکلتے ہیں۔ ان میں سے ۱۶ ایسے ہیں جو حکومت کی سرپرستی میں شایع ہوتے ہیں۔ جو اخبار حکومت کے اثر سے آزاد ہیں وہ جب ضرورت سمجھتے ہیں تو انگریزی حکومت پر تنقیدیں کرتے ہیں۔ اب پریس کی قوت ہندستان میں ایک حقیقت ہوتی جاتی ہی۔ (انڈین میل۔ مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۱ء)

ہندستانی زبان کے نئے اخبار جن کے متعلق میں نے اوپر ذکر کیا ہی مندرجۂ ذیل ہیں۔ ان میں ماہ وار رسالے اور انجمنیوں کی میعادی مطبوعات بھی شامل ہیں:-

اخبار محتشم جاورا (؟) اِس اخبار کے متعلق لکھنؤ کے اپریل ۱۸۷۱ء کے جلسۂ تہذیب میں اعلان کیا گیا تھا۔

اخبار سوشل راجپوتانہ۔ اِس اخبار کا اعلان جولائی ۱۸۷۱ء کے "جلسۂ تہذیب" میں کیا گیا ہی۔ اس کا مقصد راجپتان کے معاشرتی حالات کی اصلاح و ترقی ہی۔

اخبار سوسائٹی کان پور، اخبار ناگ پور۔ اس کا ۲۹ ستمبر ۱۸۷۱ء کے "علی گڑھ اخبار" میں ذکر ہی۔

المورڑہ اخبار۔ اس اخبار کی ہندستان میں بہت قدر ہورہی ہی۔

اخبار انجمنِ پنجاب۔ یہ اخبار ہفتے وار ہی اور ۱۸ صفحات پر مشتمل ہی۔ ہر صفحے پر چار کالم ہوتے ہیں اور ہر کالم میں ۲۵ سطریں۔ غالباً یہ اخبار وہی ہی جس کا پہلے نام "شمائے پنجاب" تھا اور جس کی نسبت میں اپنے ۱۸۷۰ء والے مضمون میں تذکرہ کر چکا ہوں۔

اس اخبار کے سرورق پر ہُما کی خیالی تصویر بنی ہوتی ہے۔ یہ اخبار "اخبار پنجاب" سے علاحدہ ہے۔[1] اسی اخبار کو "رسالۂ انجمن پنجاب" اور "رسالۂ انجمن اشاعتِ پنجاب" بھی کہتے تھے۔ جس انجمن کی طرف سے یہ اخبار شایع ہوتا ہے وہ اس کا التزام کرتی ہے کہ عام لوگوں کے مفید مطلب مضامین اس میں شایع ہوا کریں۔ چناں چہ اس میں صرف وہ یادداشتیں شایع ہوتی ہیں جو ارکانِ انجمن بھیجتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ پڑھنے والوں کی دل چسپی کے مضامین کی اشاعت بھی ہوتی ہے۔ انجمن کے صدر مسٹر لیپل گریفن ہیں اور معتمد بابو نوین چندر رائے ہیں۔ ان دونوں کی نگرانی میں اخبار نکلتا ہے۔ حکومت کی سرپرستی اس اخبار کو حاصل ہے۔ چناں چہ سرکاری طور پر اس کے ۲۰۰ نسخے خریدے جاتے ہیں۔ منشی نظام الدین اس کے مدیر ہیں۔ ۲۶ مئی سنہ ۱۸۷۰ء کی اشاعت میں جو اس وقت میرے پیشِ نظر ہے، انجمن کانگڑہ (پنجاب) کی کارروائی درج ہے۔ اس انجمن کا جلسہ منشی امین چند کلکٹر ضلع کے تبادلے کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا۔ جلسے میں جتنی تقریریں ہوئیں ان میں انجمن اور

---

[1] "ادبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ" جلد ۳۔ ص ۴۷۷

پورے ضلع کی طرف سے اظہارِ افسوس کیا گیا[1]۔ اس اخبار میں ریاست کشمیر کا حال نہایت دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہی۔ اس مضمون کے شروع میں جو ۱۵ کالم میں ہی منشی جلال الدین شیرازی نے کشمیر کی تعریف میں ایک نظم لکھی ہی۔ یہ نظم اس لائق ہی کہ اس کا انگریزی یا فرانسیسی میں ترجمہ کیا جائے۔ اس اخبار میں تصاویر بھی شایع ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دیسی لوگوں کے لیے یہ اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہی۔ اس کی آخری اشاعت میں موجودہ بادشاہِ ایران نصیرالدین کی تصویر ہی اور بوشہر کے پُل کا منظر ایک تصویر میں دکھایا گیا ہی۔

آگرہ اخبار۔ یہ ہفتے وار اخبار آگرہ سے شایع ہوتا ہی اور ۸ صفحوں کا ہوتا ہی۔ ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں۔ ایک کالم میں اُردو دوسرے میں ہندی ہوتی ہی۔ اس اخبار کا پہلے "ایجوکیشنل گزٹ" نام تھا۔ اس میں تعلیم کے متعلق مضامین اب تک شایع ہوتے ہیں۔

بدیا بلاس۔ یہ ہندی کا اخبار جموں سے نکلتا ہی۔ غالباً یہ وہی اخبار ہی جس کی نسبت مَیں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی اور ہندستانی کی تاریخ" (جلد ۳۔ ص ۴۷۰) میں ذکر کیا ہی۔

---

[1] مَیں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی اور ہندستانی کی تاریخ" میں منشی امین چند کے متعلق بہ حیثیت ہندستانی کے مضمون نگار کے ذکر کیا ہی۔ (دیکھو جلد ۲۔ ص ۱۹۹)

بدھی بلاسس - یہ اخبار بھی جموں سے مارچ ۱۸۷۰ء سے نکلنا شروع ہوا ہی اور قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہی۔

بلند اختر - اس کا پہلا نمبر دسمبر ۱۸۷۰ء میں مراد آباد سے شایع ہوا ہی۔

فیض عام - یہ ماہ وار رسالہ گجراں والہ کی ادبی انجمن کے زیرِ اہتمام نکلتا ہی۔ اس کا پہلا نمبر یکم جنوری ۱۸۷۰ء کو سیالکوٹ سے شایع ہوا۔ اس کے مدیر منشی دیوان چند ہیں جن کی ادارت میں "چشمۂ فیض" نکلتا تھا[1]

گورمنٹ گزٹ۔ اودھ سے اُردو میں شایع ہوتا ہی۔ اسی نام کا اخبار لکھنؤ سے انگریزی زبان میں بھی نکلتا ہی۔

گورمنٹ گزٹ مغربی و شمالی۔ یہ اخبار صوبہ شمالی مغربی کا ہی۔

ہندو پرکاش۔ یہ اخبار ہندی کا ہی اور کان پور کی "مجلسِ اصلاح معاشرت" کی جانب سے شایع ہوتا ہی۔ یہ انجمن مغل سرائے کی مقامی انجمن کو اپنے پرچے بھیج دیتی ہی۔[2]

ہلی شہر پترکا (؟) علی گڑھ اخبار مورخہ یکم ستمبر ۱۸۷۱ء میں اس کی تعریف کی گئی ہی۔

خورشید جہاں تاب۔ یہ اخبار آگرہ سے ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں کو شایع ہوتا ہی۔ اس کا پہلا نمبر یکم ستمبر ۱۸۷۰ء کو شایع ہوا تھا۔ اس کے ہر نمبر میں ایک یا دو صفحوں پر "جہاں گیر نامہ" شایع ہوتا ہی۔ اس کے

---

[1] "ادبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ" جلد ۳۔ ص ۴۷۹

[2] علی گڑھ اخبار۔ مورخہ ۲ جون و یکم ستمبر ۱۸۷۱ء

قلمی نسخے بہت کم یاب ہیں اور اب تک یہ طبع نہیں کیا گیا ہی۔

منو بہار۔ یہ ماہ نامہ تھانہ (بمبئی) سے کرشن جی پرسورام گوڑ کے زیرادارت نکلتا ہی۔ اس میں ہندستانی، مرہٹی، گجراتی اور سنسکرت کے مضامین ہوتے ہیں۔

مطلعِ نور۔ یہ اُردو کا اخبار کان پور سے نکلتا ہی۔

مفرّح القلوب۔ یہ رسالہ کراچی سے نکلتا ہی۔ اسی نام کا ایک اور رسالہ شکارپور سے شایع ہوتا ہی جس کے متعلق مَیں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی وہندستانی کی تاریخ" (جلد ۳۔ ص ۴۸)

میں ذکر کیا ہی۔

مُحبِّ مارواڑ۔ یہ رسالہ مہینے میں دو دفعہ نکلتا ہی۔ اس میں اُردو اور ہندی دونوں کے مضمون ہوتے ہیں۔ یہ یکم دسمبر ۱۸۷۱ء سے مارواڑ سے شایع ہوا ہی اور ۱۲ صفحات کا ہی۔ اس کا وعدہ کیا گیا ہی کہ اگر اخبار کی اشاعت بڑھی تو اس کے صفحات کی تعداد بڑھا دی جائے گی۔

نورالابصار۔ یہ اخبار الہ آباد سے نکلتا ہی۔ اسی نام کا دوسرا اخبار بھی ہی جس کے متعلق مَیں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی اور ہندستانی کی تاریخ" (جلد ۳۔ ص ۴۸۴) میں ذکر کیا ہی۔ یہ دونوں بالکل الگ الگ ہیں۔ مسٹر کمپسن کی رائے ہی کہ "نورالابصار" جو الہ آباد سے نکلتا ہی صوبۂ شمال مغربی کا بہترین اخبار ہی۔ ۹ مئی کے پرچے میں "انجمنوں" کے متعلق

ایک مضمون ہی جس میں بعض مشرقی مصنّفوں کے حوالے دیے گئے ہیں اور ۱۷ مئی کے پرچے میں الہ آباد کی سڑکوں کا حال شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہی۔ بالخصوص برسات کے موسم میں اس شہر کی سڑکوں کی جو حالت ہوتی ہی وہ نہایت دِل چسپ طریقے پر بیان کی ہی۔ اس میں "فسانۂ عجائب" کا ایک شعر لکھا ہی:۔

دیکھی نئی رِیت اس نگر میں
جوتا ہی گلی میں آپ گھر میں

پریاگ دوت۔ یہ ہندی کا اخبار بھی الہ آباد سے نکلتا ہی۔

رسالۂ ڈبیٹنگ سوسائٹی۔ یہ میرٹھ کی مجلسِ مباحثہ کا ماہ وار رسالہ ہی۔

رہ نُمائے پنجاب۔ اس کی نسبت جولائی ۱۸۷۱ء کے "رسالۂ جلسۂ تہذیب لکھنؤ" میں ذکر ہی۔

ریاضِ نور۔ ستمبر ۱۸۷۰ء سے یہ اخبار مرادآباد سے شایع ہوا ہی۔ اسی نام کا ایک اخبار ملتان سے بھی نکلتا ہی جس کے متعلق میں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ" (جلد ۳ ص ۴۸۵) میں ذکر کیا ہی۔

سندراس گزٹ۔ یہ ہندی میں شاہ جہاں پور سے شایع ہوتا ہی۔

سلبھ سچار۔ یہ ہفتے وار ہندی رسالہ ہی۔ اس کے چار صفحے ہوتے ہیں اور قیمت بہت کم، صرف ایک پیسہ ہی۔ "انڈین ریفارم ایسوسی ایشن" کی طرف سے کلکتے سے شایع ہوتا ہی۔ اس اخبار کا یہ مقصد ہی کہ غریب لوگوں کی خدمت کرے۔ اس میں

مفید اور دل چسپ معلومات اور خبریں درج ہوتی ہیں۔ اس میں دیسی لوگوں کی ضروریات اور ان کی شکایتیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ حکومت کو ان کے متعلق علم ہو اور وہ انھیں دور کرنے کی طرف توجہ کرے[1]

اُردو لا رپوٹ۔ یہ میرٹھ سے مہینے میں دو مرتبہ شایع ہوتی ہے۔ پہلے یہی "گنجینۂ احکام" کے نام سے ماہ وار نکلتا تھا۔

ذخیرۂ بال گوبند۔ یہ آگرہ سے نکلتا ہے۔

کبی بچن سدھا۔ یہ ہندی کا ادبی رسالہ بنارس سے بابو ہری چندر کے زیرِ ادارت شایع ہوتا ہے۔ اس کے سرورق پر ایک ہندی شعر لکھا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے:-

"سدھا (آبِ حیات) وہاں دست یاب ہوتا ہے جہاں غیرفانی ہستیاں سکونت پزیر ہیں۔ تمھاری رسائی اس تک دشوار ہے۔ لیکن وہ لوگ جو عقل و فہم رکھتے ہیں اس سے (اس رسالے سے) اس کو حاصل کر سکتے ہیں اور اس کا ذائقہ چکھ سکتے ہیں"

مسٹر کمپسن جو صوبۂ شمال مغربی کے ناظمِ تعلیمات ہیں، جب تعریف کرتے ہیں یا کوئی دعوا پیش کرتے ہیں تو کبھی احتیاط کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انھوں نے "کبی بچن سدھا" کے متعلق اپنی ۱۸۷۰ء کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ "ہندی کے سب رسالوں کے مقابلے میں یہ رسالہ سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کا طرزِ تحریر دل کش ہے اور اس

---

[1] انڈین میل مورخہ ۱۷ جنوری ۱۸۷۱ء

کے مضامین دل چسپ ہوتے ہیں اور ان کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے۔" یہ رسالہ خالص ادبی ہے اور مہینے میں دو دفعہ شایع ہوتا ہے۔ اس میں کبھی سیاسی معاملات پر بھی بحث کی جاتی ہے اور خبریں شایع کی جاتی ہیں۔ اس کی تقطیع پہلے بڑی ہوا کرتی تھی لیکن اب چھوٹی ہوتی ہے اور ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں۔ اس چھوٹی تقطیع کا پہلا نمبر ۱۴ ستمبر ۱۸۷۱ء کو شایع ہوا ہے۔ اس کی دوسری اشاعتوں میں ہندی شاعری کی مختلف اصناف مثلاً کبت، سورٹھ، بسنت، ہوری اور کہروا وغیرہ کے انتخابات ہیں۔ ایک ناٹک "تمبنی ناٹک" کے نام سے سلسلے وار شایع ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ" میں "سدھا برشا" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ رسالہ ہندی اور بنگالی دونوں زبانوں میں ۱۸۵۴ء میں کلکتے سے شایع ہوا کرتا تھا[1]۔

میور گزٹ ۔ اس کے متعلق میں نے اپنے ۱۸۶۹ء کے خطبے میں ذکر کیا تھا۔ یہ اُردو کا رسالہ میرٹھ سے نکلتا ہے۔ اب دیوناگری خط میں بھی اس کے مضمون اُردو کے ساتھ ساتھ شایع ہوتے ہیں۔

مخزن العلوم ۔ یہ رسالہ بریلی سے نکلتا ہے جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "ادبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ" (جلد ۳۔ ص ۴۱۳) میں ذکر کیا ہے۔

مظفر پور کی سائنٹی فک سوسائٹی اپنے رسالے "اخبار الاخیار" کو کام یابی کے ساتھ چلا رہی ہے۔ مہینے میں یہ دو مرتبہ نکلتا ہے۔ اس رسالے

---

[1] J. Long.. catalogue of Bengali Publications p. 61

کے نسخے اس کے قابل مدیر مولوی سید امداد علی خان بہادر از راہِ کرم مجھے بھیج دیا کرتے ہیں۔ یکم ستمبر ۱۸۷۱ء کی اشاعت میں ۲۰ اگست کے جلسے کی کارروائی بھی درج ہے۔

مسلمان اِس بات سے مطمئن ہیں کہ سرکاری مدارس میں ہندستانی، عربی اور فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی ان کی کلاسکی زبانیں ہیں اور وہ سنسکرت کی طرح مُردہ زبانیں نہیں ہیں ان کی وہی حیثیت ہے جو یورپ میں یونانی اور لاطینی کی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات بھی بہت پسند ہوئی ہے کہ حکومت کا ارادہ ہے کہ روزمرہ کی زبان میں نئی کتابیں لکھوائی جائیں، انگریزی سے ترجمے کرائے جائیں اور اس کام کو ترقی دینے میں ہمت افزائی کی جائے۔ مسلمانوں کی تمام علمی انجمنیں اس کے لیے حکومت کی شکر گزار ہیں۔ "اخبار الاخیار" میں ایک مضمون ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ روزمرہ کی زبان میں تعلیم دینے سے تعلیم میں سہولت پیدا ہوگی اور دیسی لوگوں کو تعلیم سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ اسی اشاعت میں میری ان چند سطروں کا ترجمہ بھی درج ہے جو میں نے مظفر پور کی انجمن کے متعلق اپنے ۱۸۷۰ء کے مقالے میں سُپردِ قلم کی تھیں۔

روہیل کھنڈ اخبار۔ مسٹر کمپسن کی رائے ہے کہ یہ ایک عمدہ اخبار ہے۔ اس میں بعض اوقات نہایت اعلا درجے کے دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔

نجم الاخبار۔ اس اخبار میں خاص طور پر تعلیمی مسائل پر مضامین ہوتے ہیں۔ اس کی رائے قابلِ قدر سمجھی جاتی ہے۔

منگل سماچار۔ اس کے متعلق میں اپنے ۱۸۷۰ء کے مقالے میں ذکر

کرچکا ہوں۔ اس میں انجمنِ ہند کی کارروائیاں درج ہوتی ہیں۔ اس انجمن کا مقصد ہندوؤں کی معاشرتی اصلاح ہو تاکہ شادی بیاہ پر فضول خرچی کو روکا جائے۔

اتالیقِ پنجاب۔ مسٹر ہولرائڈ جو پنجاب کے ناظمِ تعلیمات ہیں اور ایک روشن خیال شخص ہیں اہلِ ہند کی تعلیمی ترقی کے لیے برابر کوشاں ہیں۔ یہ ماہ وار رسالہ ان کی سرپرستی میں منشی پیارے لال کے زیرِادارت شایع ہوتا ہو۔ اس میں تاریخ، جغرافیہ اور سائنس پر نہایت مفید مضامین ہوتے ہیں۔ مسٹر ہولرائڈ کا مقصد اس رسالے سے یہ ہو کہ اہلِ ہند کی معلومات میں اضافہ ہو۔ موصوف ازراہِ نوازش یہ رسالہ مجھے برابر بھیجتے رہتے ہیں۔ اس کی آخری اشاعت میں حکومتِ انگلستان پر ایک مختصر مضمون ہو، انگلستان اور ہندستان کے بادشاہوں کی ایک فہرست ہو جس میں ان کے عہدِ حکومت کا مقابلہ کیا گیا ہو اور ایک بیس صفحے کا "کنفوشس" پر مضمون ہو۔

علی گڑھ اخبار۔ دیسی اخباروں میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہو اس واسطے کہ اس میں سید احمد خاں بہادر کے مضامین اور بعض اوقات ان کے جوابات شایع ہوا کرتے ہیں۔ اس اخبار کے بعض مضامین ایسے ہیں جن کا ذکر صوبۂ شمال مغربی کے ناظمِ تعلیمات کی ۱۸۶۷ء کی رپوٹ میں کیا گیا ہو۔ اس اخبار کی ۷ جولائی ۱۸۶۷ء کی اشاعت میں

ایک مضمون میری نظر سے گزرا جس میں پٹیالہ کے پنڈت کاشی ناتھ نے اخبارات کی اس ذمے داری پر بحث کی ہو جو قومی بیداری پیدا کرنے کے لیے ان پر عائد ہوتی ہو۔ پنڈت جی اپنی ہندستانی نظموں اور دوسری تصنیف کے باعث مشہور ہیں۔ ان کے متعلق مَیں نے اپنی کتاب "اَدبِ ہندی و ہندستانی کی تاریخ" میں بھی (جلد ۲ ص ۱۲۶) ذکر کیا ہو۔ اس اخبار کی ۱۱ر مئی ۱۸۸۱ء کی اشاعت میں سید خیرالدین وزیرِ اعظم ٹیونس کی کتاب "رقوم المسالک" کے مقدمے کا ترجمہ درج ہو۔ اس کتاب میں اس ملک کی تصویر کھینچی گئی ہو۔ جہاں اسلامی نقطۂ نظر سے اچھا نظم ونسق کیا گیا ہو۔ ۶ر اکتوبر کی اشاعت میں ایک مضمون ہو جس میں تعلیم یافتہ اور ہوش مند اہلِ ہند سے اپیل کی گئی ہو کہ وہ آیندہ نسلوں کے لیے اپنی تحریر یا کسی اور ذریعے سے اپنی یادگار میں ادارے قائم کیے جائیں یا جو ادارے انھوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے قائم کیے ہیں ان کے باقی رہنے کا انتظام کریں۔ ۱۳ر اکتوبر کے نمبر میں عربی الفاظ "تصنیف" اور "تالیف" کے فرق پر ایک عالمانہ منظوم شایع ہوا ہو۔

اخبار تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ کا یہ اخبار خاص طور پر مسلمانوں کے مذہبی مسائل سے بحث کرتا ہو۔ اس میں میری

نظر سے سیّد احمد خاں کا ایک مضمون گزرا جس کا
عنوان "مذہبی عقائد اور تعلیم عامہ" تھا۔ اس مضمون
میں سیّد صاحب نے یہ ثابت کیا ہی کہ تعلیم کے
نصاب میں سے مذہبی تعلیم کو خارج نہیں کیا
جا سکتا۔ علی گڑھ کی سائنٹی فک سوسائٹی کے اخبار
"علی گڑھ اخبار" میں سیّد صاحب کا یہ مضمون نقل
کیا گیا تھا۔ اس پر "اودھ اخبار" نے مخالفت کی
اس لیے کہ اس اخبار کی پالیسی یہ ہی کہ وہ ہندوؤں
اور مسلمانوں دونوں کو خوش کرنا چاہتا ہی۔ غرض کہ
کچھ عرصے تک دونوں اخباروں میں نوک جھوک
ہوتی رہی۔

لکھنؤ سے "رسالۂ جلسۂ تہذیب" کی نومبر ۱۸۷۰ء کی اشاعت میں
۲۲ صفحوں کا ایک مضمون شایع ہوا ہی جس میں انگریزی حکومت کے
ان مساعی کا ذکر ہی جو اس نے ہندستان میں علوم و فنون اور صنائع
کی ترقی کے لیے کی ہیں۔ یہ مضمون ایک مسلمان کے قلم کا لکھا ہوا ہی جن
کا نام مولوی محی الدین خاں صاحب بہادر رئیسِ کاکوری ہی۔ موصوف
علم دوست شخص ہونے کے علاوہ اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک
زمانے میں موصوف سرکارِ اودھ کی طرف سے انگلستان کے شاہی دربار
میں مامور تھے میری اُن سے اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب وہ نوابِ اودھ
کی والدہ کے ساتھ پیرس تشریف لائے تھے۔ نوابِ اودھ کی والدہ کا یہیں
انتقال ہو گیا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلسِ نظما نے ۱۹ر جولائی ۱۸۵۴ء کے اپنے مراسلے میں اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ یہ اس کا فرض ہے کہ مفید علوم و فنون کے ذریعے اہلِ ہند کی اخلاقی اور مادی حالت درست کی جائے۔ ان الفاظ سے ہندستان کی حکومت کے اُس ارادے کا پتا چلتا ہے جو وہ اہلِ ہند کی تعلیم کے متعلق رکھتی تھی۔ مسٹر پیل نے جو احاطۂ بمبئی کے ناظمِ تعلیمات ہیں، ان مذکورہ بالا الفاظ کو اپنی سالانہ رپوٹ بابت ۱۸۶۹ء ۱۸۷۰ء کا زیب عنوان بنایا ہے۔ اس ۵۴۸ صفحات کی رپوٹ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر پیل نے ان الفاظ کو کس طرح عملی جامہ پہنانے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ لیکن اس رپوٹ میں ہندستانی کے متعلق بہت کم معلومات دست یاب ہوتی ہیں اس واسطے کہ احاطۂ بمبئی میں مرہٹی اور گجراتی کا عام طور پر زیادہ رواج ہے۔

مسٹر ہاول نے برطانوی ہند کے جو تعلیمی اعداد و شمار شایع کیے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان بھر میں مدرسے جانے والے طلبا کی تعداد ۲۵ لاکھ کے قریب ہے۔ ان مدارس میں ہندستانی یا دوسری مقامی زبانوں کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے۔ صرف کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونی ورسٹیوں میں انگریزی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ قومی درس گاہوں کے طلبا کی تعداد ۱۰۹۶۰۲۸ ہے جو ۴۷۰۶۷ مدارس میں تعلیم پاتے ہیں۔ ۵ لاکھ طلبا سرکاری مدارس میں ہیں۔ ایسے مدرسے جنھیں سرکاری امداد ملتی ہے ۲۷۵۷۲ ہیں اور ان میں ۳۰۱۷۸۹ طلبا پڑھتے ہیں۔ حکومت کا یہ بھی ارادہ ہے کہ ان ہندستانی لوگوں کے لیے جنھیں حصولِ معاش کے مشاغل کے باعث دن میں فرصت نہیں ملتی

ان کے لیے مدارسِ شبینہ کا انتظام کیا جاتے۔ اگر اس منصوبے میں کامیابی ہوئی تو طلبا کی تعداد بڑھ جائے گی[1] ایسے مدرسے جو بالکل آزاد ہیں اور کسی قسم کی سرکاری امداد نہیں لیتے۔ تعداد میں ۲۳۶۲ ہیں اور ان میں ۳۴۹۳۷ طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ احاطۂ بمبئی میں طلبا کی تعداد سب سے زیادہ ہو اس کے بعد صوبہ شمال مغربی، بنگال، پنجاب اور مدراس کا نمبر آتا ہو۔ اگرچہ اودھ کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ ہو لیکن وہاں طلبا کی تعداد صرف ۳۲۶۴۸ ہو۔ لکھنؤ کے ماڈل اسکول کے صدر بابو رام چندر سین ہیں۔ اس اسکول کی خصوصیت یہ ہو کہ یہاں اُردو زبان کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہو تاکہ اس زبان کے ذریعے تہذیب کو ترقی ہو۔ اس اسکول کے ایک مدرس نے جس کا نام مولوی امان الحق ہو "امان اللغات" کے نام سے ایک لغت شایع کی ہو جس میں عربی الفاظ کے اصلی معنوں اور ان کے اُردو میں مروجہ معنوں کا فرق واضح کیا ہو۔

کیننگ کالج میں ۴۷۹ طلبا اُردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور صرف ۲۴ ہندی کی۔ لکھنؤ کے مارتینیر کالج میں ۱۸۷۰ء میں ۲۷۱ طلبا تعلیم پاتے تھے جن میں سے ۲۰۰ اُردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور ۳۵ فارسی کی اور انگریزی زبان سبھوں کے لیے لازمی تھی۔

ہندستان کے تمام شہروں میں کتب خانے قائم ہو گئے ہیں۔ ان

---

[1] ضلعوں کے ایک ہزار مدارس میں جو براہ راست انگریزی حکومت کے تحت ہیں، جسمانی سزا کی اجازت نہیں ہو سوائے غیر معمولی حالات کے۔ عام طور پر طلبا کو یہ سزا دی جاتی ہو کہ مدرسے کے اوقات ختم ہونے کے بعد انھیں تھوڑی دیر کے لیے روک لیا جاتا ہو۔

کتب خانوں سے قصبات کے مدرس اپنے نام کتابیں جاری کرا سکتے ہیں بشرطے کہ وہ برائے نام تھوڑی سی رقم ادا کیا کریں۔ لکھنؤ کے کتب خانے میں جو صرف دو سال کا عرصہ ہوا قائم کیا گیا ہے اس وقت ۲۹۴ کتب موجود ہیں جن میں سے بیش تر اُردو کی ہیں۔ لکھنؤ کے ریفارم کلب کے کتب خانے میں بچّوں کی کتابوں کا ۱۱۶۲ جلدوں کا ذخیرہ موجود ہے۔

بنگال میں تعلیمِ نسواں کو خوب ترقی ہو رہی ہے۔ زنانہ تعلیم کا والدین یا بھائی ایسا انتظام کرتے ہیں کہ مشرقی اور مغربی تعلیم کے فوائد سے عورتیں مستفید ہو سکیں۔ چوں کہ عورتیں پردے میں رہتی ہیں اس لیے ان کی تعلیم میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ان تک صرف ان مردوں کی رسائی ممکن ہوتی ہے جو اُن کے بالکل قریبی عزیز ہوتے ہیں۔ مدارسِ نسواں کی تعداد بہت محدود ہے اور ان میں صرف ایک خاص طبقے کی عورتیں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اگرچہ ہندستانی عورتیں تعلیم حاصل کرنے کی بہ درجۂ اتم صلاحیت رکھتی ہیں لیکن رسوم و روایات ان کے تعلیم حاصل کرنے میں مانع آتے ہیں۔

مسلمانوں میں عام طور پر ہمیشہ سے عربی اور فارسی کی تعلیم کا رواج رہا ہے اور مسلمان عورتیں بھی عربی فارسی سیکھتی تھیں اور آج بھی سیکھتی ہیں۔ اِن زبانوں کے سیکھنے سے یہ خاص فائدہ ہوتا ہے کہ قرآن اور دوسری مذہبی کتب کے پڑھنے کے علاوہ ادبیات کی کتابیں بھی مستورات اپنی طویل فرصت کے اوقات میں پڑھتی ہیں۔ قرآن اور دوسری مذہبی کتب کے پڑھنے سے انھیں روحانی تشفّی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اعلا طبقوں کی عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں بالکل جاہل رہتی

ہیں اور انھیں کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ ان کی تعلیمی آزادی انگریزی حکومت کی رہینِ منت ہی۔

ہندستان میں بالعموم انگریزی تعلیم کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہوگیا ہی اور خاص طور پر صوبۂ شمال مغربی میں مشرقی علوم اور السنہ کی طرف توجہ کی جارہی ہی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اہلِ ہند ایسے ادارے قائم کررہے ہیں جہاں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے تاکہ یورپین اثرات سے بچاؤ ممکن ہو۔ یہ مدارس باوجود سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے خوب ترقی کررہے ہیں جس طرح یورپ میں نشاۃِ ثانیہ کے وقت یونانی اور لاطینی سیکھنے کا لوگوں کو شوق پیدا ہوگیا تھا بالکل اسی طرح آج کل ہندستان میں سنسکرت اور عربی کا چرچا بڑھ گیا ہی۔ ان دیسی مدرسوں میں قابل اساتذہ پڑھاتے ہیں اور ان کے درسوں میں لوگ شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ ان مدرسوں میں صرف کلاسکی علوم ہی نہیں پڑھائے جاتے بلکہ ان کے ساتھ جدید ادبیات کی تعلیم کا بھی انتظام ہی تاکہ جدید طرز کے انشا پرداز پیدا ہوں۔[1]

جیسا کہ کرنل نسو لیز نے کہا ہی اہلِ ہند کی یہ خواہش ہی کہ وہ مغربی علوم و فنون حاصل کریں لیکن اپنی مروّجہ زبانوں کے ذریعے سے نہ کہ انگریزی کے توسط سے۔ وہ انگریزی زبان اپنی خوشی سے سیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ انھیں اس زبان میں امتحان کامیاب کرنے پر مجبور کیا جاتے جو ان کی اپنی زبان سے بالکل مختلف ہی۔ بنگال میں یورپین تعلیم کا رواج بہ نسبت ہندستان کے دوسرے حصوں کے

[1] ڈاکٹر لیٹنر کے زیرِ سرپرستی لاہور سے ایک عربی رسالہ جاری ہوا ہی جس کا نام النفع العظیم ہی۔

زیادہ پایا جاتا ہی لیکن بنگال کُل ہندستان نہیں ہو۔ شمالی ہند کے باشندے جو اہلِ بنگال کے مقابلے میں زیادہ جان دار ہیں اپنی زبان اور اپنی روایات کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ مسلمان اور ہندو دونوں اپنی قدیم زبانوں اور ادبیات کا احترام کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچّے انگریزی کی تعلیم کی خاطر اپنی روایات سے بیگانہ رہیں اور اپنے مذہب اور اپنی رسوم سے انھیں ایک طرح کی نفرت پیدا ہو جائے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کو اس میں سہولت ہوتی ہو کہ اپنی زبان دیسی لوگوں کو سکھائیں بہ جائے اس کے کہ ان کی زبان خود سیکھیں۔ شمال مغربی صوبے کے لوگوں کو یہ بھی شکایت ہو کہ حکومت انگریزی داں بنگالیوں کو اعلا خدمات پر مامور کرتی ہو بہ جائے اس کے کہ مقامی لوگوں کو اعلا عہدے سپرد کیے جائیں جو بالعموم انگریزی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ بنگالی لوگ واقعی نہایت ذہین ہوتے ہیں۔ انھوں نے بڑے شوق سے انگریزی تعلیم حاصل کی ہو لیکن جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے اہلِ بنگال ہندستان کے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے پست حالت میں ہیں۔[1] مسلمانوں کا حکومت سے یہ مطالبہ ہو جیسا کہ امیر علی خان نے اپنی لندن کی تقریر میں کہا تھا کہ ان کے اور ہندوؤں کے درمیان غیر جنبہ داری کا برتاؤ کیا جائے۔

کلکتہ یونی ورسٹی نے اپنے امتحانات کی جانچ انگریزی زبان میں رکھنے کے لیے مندرجۂ ذیل دلائل پیش کیے ہیں: (۱) کوئی اورینٹل کالج ایسا موجود نہیں جہاں تاریخ، سائنس اور فلسفے کی اعلا تعلیم کا انتظام

---

1. The oriental Movement in the North West

ہو اور امتحانات کی تیاری کی جا سکے (۲) اعلا جماعتوں کے لیے انگریزی کے علاوہ کسی زبان میں کتابیں موجود نہیں ہیں۔ (۳) مترجمین کی نااہلیت (۴) دیسی زبانوں میں سائنٹفک اصطلاحوں کو ادا کرنے کی عدمِ صلاحیت۔ لیکن اگر یہ سب وجوہ دُرست بھی ہوں تو کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ دیسی زبانوں کے ذریعے امتحان میں شرکت کرنا چاہتے ہیں انھیں ایسا کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ لیکن حقیقت میں جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ دیسی زبانوں میں نہ کتابوں کی کمی ہے اور نہ مترجموں کی۔ اُردو میں مغربی علوم اچھی طرح ادا کیے جا سکتے ہیں اور اس میں بہ درجۂ اتم یہ صلاحیت موجود ہے کہ قوانینِ فطرت، فلسفہ اور سائنس کے مطالب بیان کیے جا سکیں۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کلکتہ یونی ورسٹی کی سنڈیکیٹ نے پیش تر اس کے کہ دوسرے طریقوں کی چھان بین کرے۔ من مانے طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیے اور یہ طریقِ تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی ہونا چاہیے۔ کلکتہ یونی ورسٹی کی سنڈیکیٹ نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ آیا دیسی زبان میں سائنٹفک اصطلاحات ادا کی جا سکتی ہیں یا نہیں؟ اس کا "ثبوت اس وقت اچھی طرح مل سکتا تھا جب کہ یونی ورسٹی کے اعلا امتحانوں میں طلبا کو اس کا موقع دیا جاتا کہ وہ دیسی زبان میں اپنے مطالب ادا کریں۔ شمالی ہند کے ہندستانی لوگ صرف یہی چاہتے ہیں کہ انھیں یہ موقع دیا جائے۔ اگر حکومت اس تجویز کو منظور کر لے تو ہندستان کی آبادی کا بڑا حصہ وہ فوائد حاصل کر سکے گا جو اب تھوڑی سی تعداد کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں۔ اس سے یہ بھی

ہوگا کہ اعلا عہدوں پر یورپ زدہ ہندستانیوں کا اجارہ ختم ہو جائے گا۔ اس تجویز کو منظور کرنے سے حکومت اہلِ ہند کے ایک بڑے طبقے کو اپنا گرویدہ بنا لے گی جو انگریزی زبان کی لازمی تعلیم کو پسند نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ جو اب انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں جانے سے احتراز کرتے ہیں، مشرقی مدارس میں خوشی سے شرکت کریں گے اور جدید تمدن کی برکتوں سے مستفید ہو سکیں گے جس کے متعلق ہندستانی زبان کے ذریعے انھیں معلومات حاصل ہوں گی۔ ہندستانی زبان سے ان لوگوں کو جو دلی تعلق ہے وہ انگریزی سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر حکومت نے اپنے نظامِ تعلیم میں یہ تبدیلی قبول کر لی تو انگریزی اداروں کی انصاف پسندی اور انسانیت دوستی کا اہلِ ہند کو احساس پیدا ہو گا در آں حالے کہ اب اُنھی اداروں کے متعلق ان کی واقفیت ناقص ہے اور اسی لیے وہ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ ہندستانی زبان میں تعلیم ہونے سے اہلِ ہند کی تعلیمِ عامہ کو بہت فروغ حاصل ہو گا۔ مغربی خیالات کی بدولت ان کے ادب کو ترقی حاصل ہو گی اور ان کی زبان کے نشو و نما میں مدد ملے گی۔ اب اندھا دُھند انگریزی الفاظ ہندستانی میں ٹھونسے جا رہے ہیں لیکن اگر زبان کی ترقی ہوتی تو اس بات کی تمیز بھی پیدا ہو گی کہ کون سے لفظ مفید ہیں اور کون سے بے کار ہیں اور زبان میں نہیں کھپ سکتے۔ مولوی اور پنڈت لوگ جب مغربی علوم و فنون کے ترجموں کو پڑھیں گے تو انھیں احساس ہو گا کہ تمام انسانی علوم صرف سنسکرت اور عربی زبان تک محدود نہیں ہیں جیسا کہ وہ اس وقت یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ

اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔
انگریزی درس گاہوں میں ہندستانی لوگ جو مغربی علوم حاصل کرتے ہیں اس کا اثر بہت محدود رہتا ہے۔ قوم کی زندگی میں اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا۔ انگریزی داں طبقے کی گویا ایک علاحدہ ذات سی بن گئی ہے۔ یہ انگریزی داں اپنے خیالات سے اپنے ہم وطنوں کو اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعے مستفید نہیں کرتے۔ ان کی معلومات اُنھی تک محدود رہتی ہیں۔ یہ لوگ دیسی زبانوں کی ادبی مجلسیں قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتے۔ اس واسطے کہ وہ اپنے ادب اور اپنی زبان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ انگریزی سے ہندستانی میں ترجمہ تک نہیں کر سکتے اور اگر کرتے ہیں تو ہندستانی محاوروں کے ساتھ انگریزی محاورے اس طرح ملا دیتے ہیں کہ وہ صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ انگریزوں کی طرح انگریزی لکھنے پر فخر کرتے ہیں۔
مشرقی مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبا کی استعداد اچھی خاصی ہوتی ہے لیکن وہ مغربی علوم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ انگریزی درس گاہوں سے بعض نہایت لائق طلبا نکلے ہیں جن کی سائنس کی معلومات اعلا درجے کی ہوتی ہیں لیکن مشرقی ادب سے وہ بالکل بیگانہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی توقع ہے کہ کچھ عرصے بعد دونوں قسم کی درس گاہوں میں ایک طرح کی مفاہمت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی درس گاہوں میں قدیم مشرقی علوم رائج کیے گئے ہیں لیکن نہایت محدود طریقے پر۔ اسی طرح مجھے توقع ہے کہ مشرقی درس گاہوں میں انگریزی کی تعلیم رائج کی جائے گی۔ اس طرح دونوں طریقہ ہائے تعلیم

میں ایک قسم کی خوش گوار مسابقت پیدا ہو جائے گی۔

کلکتہ یونی ورسٹی کی سنڈیکیٹ نے قطعی طور پر فیصلہ کیا ہی کہ وسطانیہ کے امتحانات ہندستانی اور دوسری مروجہ زبانوں میں ہونے چاہییں۔ وسطانیہ کے آخری امتحان کے بعد امیدوار کو اس کی قابلیت کی تصدیق کا صداقت نامہ دیا جائے گا۔ اس قسم کا پہلا امتحان یکم مارچ ۱۸۷۲ء کو منعقد ہو گا۔[۱] اُردو میں سید احمد خان کی "آثار الصنادید" اور "دیوانِ غالب" نصاب میں شامل ہیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ خالص انگریزی تعلیم کا اثر جسے ہندستان میں لارڈ میکالے نے جاری کرایا، کچھ کم ہو جائے گا۔ بھلا مشرق کو مغرب بنانا، چاہے اس کے نتائج کچھ بھی نکلیں، ایک ناممکن بات کی کوشش کرنا نہیں تو کیا ہی۔

پنجاب اور صوبۂ شمال مغربی کے ہندستانیوں کی یہ دیرینہ آرزو ہی کہ ان کے لیے ایک مشرقی جامعہ قائم کی جائے۔ دیکھیے یہ آرزو کب پوری ہو؟۔ فی الحال انھیں یونی ورسٹی کالج لاہور کے قیام پر صبر شکر کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر لیٹنر نے جو اس کالج کے پرنسپل ہیں، اپنی رپوٹ میں اس کالج کی ترقی کے نہایت امید افزا حالات بیان کیے ہیں۔[۲] مجھے پوری توقع ہی کہ عنقریب یہ کالج خوب فروغ حاصل کرے گا۔ اس کالج کا سرمایہ جنوری ۱۸۷۰ء میں ۱۰۵۶۰۳ رُپے تھا اور اب ۲۹۴۴۶۷ رُپے

۱۔ علی گڑھ اخبار۔ مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۸۷۱ء

۲۔ ڈاکٹر لیٹنر صرف ہندستان ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی علمی خدمات کے صلے میں ملکۂ معظمہ نے انھیں سی۔ آئی۔ ای کے خطاب سے سرفراز کیا ہی۔ مجھے توقع ہی کہ بہت جلد وہ اسٹار آف انڈیا کے خطاب سے سرفراز ہوں گے۔

ہی۔ اس کی سالانہ آمدنی پہلے ۲۲۶۸۰ رُپے تھی اور اب ۴۲۲۲۰ رُپے سالانہ ہی۔ اس درس گاہ کی بدولت پنجاب میں سرکاری کالجوں کی تعداد اب ۴۴ ہو گئی ہی۔ اس میں طلبا کی تعداد ۱۷۶ ہی جو سب ۱۶ سال کی عمر سے زیادہ کے ہیں۔ رپوٹ میں ان امیدواروں کی تعداد درج ہی جنھوں نے امتحان میں کام یابی حاصل کی ہی۔ اب انھیں وہ فوائد حاصل ہوں گے جن کے وہ متوقع تھے۔ کام یابی حاصل کرنے والے امیدواروں میں ۱۷ مسلمان ہیں ۴۹ ہندو اور سکھ ہیں۔

اس درس گاہ میں تعلیم کا طریقہ تینوں سرکاری یونی ورسٹیوں سے مختلف ہی جہاں ریاضی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہی۔ یہاں یونان و رُوم کی تاریخ کے بجاے سرکاری یونی ورسٹیوں کے دستور کے خلاف ایشیا کی تاریخ پر زیادہ زور دیا جاتا ہی اس لیے کہ یورپ کی تاریخ کے مقابلے میں اہلِ ہند کے لیے یہ زیادہ مفید ہی۔

ہزار رُپے ان مصنفین و مولفین کی امداد کے لیے حکومت کی طرف سے رکھے گئے تھے جن کی کتابیں سلیس ہندستانی زبان میں ایسے موضوع پر ہوں گی جو عام طور پر مفید ہوں۔ ان کتابوں کی طباعت کے لیے ایک ہزار سات سو رُپے علاحدہ تھے۔ اس کے علاوہ ہزار رُپے کے دو انعام رکھے گئے جو علومِ فطرت اور علومِ صحیح پر بہترین مضمون لکھنے والوں کو دیے جائیں گے۔

لاہور کا شعبۂ طب جس کا افتتاح ۲ر دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء کو ہوا یونی ورسٹی کالج کا ایک حصہ ہوگا۔ علمِ طب کے طلبا اور دیسی اطبا کے لیے یہاں کیمیا، علم الاجسام اور دواتی کے کام کی تعلیم دی جائے گی۔ یہاں درس

ہفتے وار ہوا کریں گے۔ ایامِ حمل، زچگی اور بچوں کے متعلق ہندستانی زبان میں جو رسائل لکھائے گئے ہیں وہ صوبے کے سب سول اسپتالوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ اُردو میڈیکل گزٹ جو ماہ وار نکلتا ہے اس کے نسخے تین سو کی تعداد میں شایع ہوتے ہیں۔ مغربی علمِ طب اور جراحی کے متعلق ایک مستند کتاب اُردو میں لکھائی جا رہی ہے اور عنقریب شایع ہو جائے گی۔

ہندوؤں کے مدارس میں الہ آباد کا "دھرم گیان اپدیش پاٹ شالہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ مدرسہ جولائی سنہ ۱۸۶۹ء میں قائم کیا گیا۔ یہاں ہندی، سنسکرت، ریاضی اور انگریزی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ انگریزی کی تعلیم پنڈت کاشی ناتھ کے سپرد ہے جو اس کام کے اہل ہیں۔ ۸؍ جنوری سنہ ۱۸۷۱ء میں اس مدرسے میں پنڈت ہردیودت کے زیرِ صدارت جلسۂ تقسیمِ اسناد منعقد ہوا۔ صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں ان والدین کی خوب خبر لی جو اپنے بچوں کی مذہبی اور ذہنی تعلیم کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ اس کے بعد طلبا نے قدیم مذہبی کتابوں میں سے مناجاتیں پڑھیں جنھیں حاضرینِ جلسہ نے بہت پسند کیا۔ یہ مناجاتیں ایسی ہیں کہ ان کے خلاف کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا اور ان سے بچوں کی مذہبی تعلیم کا مقصد بہ درجۂ اتم پورا ہو جاتا ہے۔[1]

مہاراجا کشمیر و جموں نے اپنی ریاست میں ایک کالج قائم کرنے کے لیے ایک لاکھ رُپیہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ اتنی ہی رقم دو مدرسوں کے لیے سالانہ دینے کا وعدہ کیا ہے جہاں پنڈت بخشی رام کی نگرانی میں

---

[1] علی گڑھ اخبار۔ مورخہ ۱۷؍ فروری سنہ ۱۸۷۱ء

پان سو طلبا کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا تاکہ ریاست کے آیندہ عہدے دار ان مدارس کے تعلیم یافتہ ہوں۔ ان مدرسوں میں انگریزی اور ہندستانی کے علاوہ قدیم زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہوگا۔ سائنٹفک کتابوں کے ترجمے اور طباعت کے لیے ۳۰ ہزار رُپے کی منظوری دی گئی ہے۔[1]

راجکوٹ (کاٹھیاواڑ) میں راج کماروں کے کالج کا ۱۷ دسمبر ۱۸۷۰ء کو سر ایس فِٹز جیرلڈ گورنر صوبۂ بمبئی نے افتتاح کیا۔ افتتاحی رسم نہایت شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ میں ۱۸۷۰ء کے مقالے میں اس کے متعلق ذکر کرچکا ہوں کہ کرنل کیٹنگ کو سب سے پہلے اس کالج کے قائم کرنے کا خیال آیا تھا۔ اس جلسے میں مسٹر پیل ناظم تعلیمات صوبۂ بمبئی نے بھی شرکت کی۔ موصوف اب اپنے عہدے کے فرائض سے سبک دوش ہو چکے ہیں اور مسٹر چیسٹر مکنٹن ان کی جگہ ناظم تعلیمات مقرر ہوئے ہیں۔ کاٹھیاواڑ کے والیانِ ملک کے ولی عہد اور دوسرے راج کمار تعلیم و تربیت کی غرض سے اس کالج میں شریک ہو چکے ہیں۔ اس کالج کے سرمایے میں ابھی حال میں ۴ لاکھ ۵۰ ہزار فرانک کا مزید اضافہ ہوا ہے۔[2]

کچھ کے راؤ صاحب کا مدت سے ارادہ تھا کہ 'منڈوی' میں ایک ہائی اسکول قائم کیا جائے۔ اس کے لیے ڈیڑھ لاکھ رُپے کی رقم علاحدہ رکھ دی گئی تھی۔ حال ہی میں اس مدرسے کا افتتاح ہوگا۔ راؤ صاحب

---

[1] اخبار عالم۔ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۸۷۱ء (میرٹھ)

[2] انڈین میل مورخہ ۲۹ اگست ۱۸۷۱ء

نے وعدہ کیا ہو کہ وہ پانچ ہزار رُپے سالانہ اس مدرسے کی داشت کے لیے دیں گے تاکہ اس رقم میں سے طلبا کو بھی وظائف دیے جاسکیں اور طلبا کی ایک مقررہ تعداد کے بہم پہنچنے کا اطمینان ہو سکے۔[1]

مہاراجا پٹیالہ نے جو ہندستانی والیانِ ریاست میں نہایت روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہیں، اپنی ریاست میں تعلیمِ عامہ کو بہت فروغ دیا ہو۔ مہاراجا کے وزیرِ اعظم خلیفہ سیّد محمد حسین نے تعلیم کا ایک خاکہ تیار کیا ہو جس کے مطابق عمل ہو رہا ہو۔ خلیفہ سیّد محمد حسین کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے بھی رُکن ہیں۔ انھوں نے ریاست کے محکمۂ تعلیمات کے لیے ایک علاحدہ وزیر مقرر کیا ہو۔ پٹیالہ کالج میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہو اور انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہو۔ ریاست پٹیالہ کے بارہ شہروں میں بھی مدارس قائم کرنے کا حکم ہو چکا ہو۔

ان مدارس میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ وزیرِ اعظم نے یہ بھی فیصلہ کیا ہو کہ انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت کی مستند کتب کا اُردو میں ترجمہ کرایا جائے اور مترجموں کو اس کا معاوضہ دیا جائے۔ نیز ان کتابوں کی طباعت کا ریاست کی طرف سے انتظام ہو۔

مہاراجا پٹیالہ نے ڈیوک آف اڈنبرا کی تشریف آوری کے موقع پر لاہور کی شرقی جامعہ کے قیام کے لیے ۷۰ ہزار رُپے کا عطیہ دیا ہو۔

تعلیمِ عامہ کے دیسی مدارس میں ضلع مرزا پور کا مدرسہ بھی قابلِ ذکر ہو۔ گزشتہ فروری کے مہینے میں ایک طالب علم کو عربی کی سند دی گئی ہو۔

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۱ مارچ ۱۸۷۰ء

سند کے ساتھ دستار بھی دی جاتی ہے۔ یہ دستور اس قسم کا ہے جس طرح ہمارے ہاں "لورتے" کے پھولوں کا تاج پہناتے ہیں۔[1]

۶ جنوری ۱۸۷۱ء کو سر ولیم میور، لفٹننٹ گورنر صوبۂ شمال مغربی نے گورکھپور میں ایک دربار منعقد کیا جس میں بڑے بڑے امرا نے شرکت کی۔ اس دربار کا مقصد یہ تھا کہ امرا اور زمیں داروں کے مادی اور اخلاقی مفاد کے متعلق غور کیا جائے۔ لفٹنٹ گورنر نے حسبِ معمول ہندستانی زبان میں تقریر کی اور حاضرین سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی طرف متوجہ ہوں اور حکومت کی حتی الامکان مدد کریں تاکہ بچوں کو مار ڈالنے کی رسمِ قبیحہ اور دوسری معاشرتی خرابیوں مثلاً شادی کے فضول اخراجات وغیرہ کی اصلاح ممکن ہو۔ موصوف نے کہا کہ ضلع کے امرا کے باہمی تعاون ہی سے یہ ممکن ہوگا کہ شہری زندگی کی آسایش میں اضافہ ہو اور ضلع گورکھپور مرفہ الحالی اور علم کی ترقی میں ملک کے دوسرے حصوں کے دوش بہ دوش کھڑا ہو سکے۔[2]

سر ولیم میور نے ۲۷ جنوری ۱۸۷۱ء بنارس میں ایک اور دربار منعقد کیا جس میں دیسی امرا اور رؤسا نے شرکت کی۔ موصوف نے نہایت سلیس ہندستانی میں اس موقع پر تقریر کی اور کہا کہ صوبۂ شمال مغربی کو احاطۂ بنگال پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس صوبے میں زراعت پیشہ لوگوں کی ابتدائی تعلیم کا گاؤں میں خاص انتظام کیا گیا ہے۔ ان ابتدائی مدرسوں میں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں لیکن صوبۂ شمال مغربی میں

---

[1] علی گڑھ اخبار ۲۶ فروری ۱۸۷۱ء

[2] علی گڑھ اخبار ۳ فروری ۱۸۷۱ء

اعلا تعلیم کا انتظام اتنا اچھا نہیں ہے۔ بلا شبہ شہر بنارس میں اعلا تعلیم کی سہولتیں موجود ہیں اس لیے کہ یہ شہر صوبے کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے اور پھر نسبتاً کلکتہ سے قریب بھی ہے۔ الٰہ آباد میں سنٹرل کالج یا یونیورسٹی کالج قائم کرنے کی جو تحریک ہے وہ امید ہے کہ بار آور ہوگی۔ اس کالج کے قیام کے لیے مہاراجا بنارس اور دوسرے امرا نے بڑی فیاضی سے عطیات دیے ہیں۔ یہ بھی تجویز ہے کہ الٰہ آباد میں ایک طبی (میڈیکل) کالج بھی قائم کیا جائے جس کے لیے مہاراجا وزیانگرم نے عطیہ عنایت کیا ہے۔ جلسے کے اختتام پر سر ولیم میور نے ملکہ معظمہ کی جانب سے دو ہندو عالموں کو اسٹار آف انڈیا کے خطاب عطا کیے۔ یہ دونوں ہندو عالم راجا جے کشن داس بہادر اعزازی معتمد مجلس ادبی، علی گڑھ اور بابو شیو پرشاد ہیں۔ بابو صاحب کے اوصاف میں ایک یہ بھی ہے کہ آپ ہندستانی کے فصیح شاعر ہیں اور 'وہبی' تخلص کرتے ہیں۔

ہاتھرس میں ایک جدید مدرسے کے افتتاح کے موقع پر راجا جے کشن داس نے ایک نہایت مؤثر تقریر کی جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ راجا صاحب کی تقریر کے بعد مسٹر ایچ۔ ایم جینز مجسٹریٹ ضلع نے نہایت فصیح ہندستانی میں حاضرین کو خطاب کیا۔ موصوف کی تقریر میں ایسی روانی تھی جیسی کہ کسی اہل زبان کی تقریر میں ہوتی۔ موصوف نے دوران تقریر میں وہی مشرقی تشبیہیں استعمال کیں جو حاضرین کے دل نشین ہو سکتی تھیں اور کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ تعلیم عامہ کو ترقی دینے کے لیے حکومت کی مساعی میں خود

اہلِ ہند شریک ہیں جیسا کہ اس جلسے سے ظاہر ہی۔ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہی جس سے لوگوں کی اخلاقی بہتری پیدا ہو سکتی ہی۔ یہ جلسہ عبدالرزاق کی نظم پر ختم ہوا۔[۱]

سید احمد خاں بہادر انگلستان میں دو سال تک رہے۔ ان کا جس طرح خیر مقدم کیا گیا اور جس طرح سب لوگ خوش اخلاقی سے ان سے پیش آئے اس سے سید صاحب بہت متاثر ہوئے ہیں۔ سید صاحب نے صاف صاف لکھا ہی کہ میری دلی تمنا ہی کہ میرے ہم وطن بھی اخلاق واطوار کے وہ طریقے سیکھیں جو انگریزی قوم میں پائے جاتے ہیں۔ سید صاحب نے اس باب میں جو رائے ظاہر کی ہی اس کے سبب سے ہندستان میں ان کے بہت سے دشمن ہو گئے ہیں۔ لیکن ایک ہندستانی مضمون نگار نے میرٹھ کے "اخبارِ عالم" میں سید صاحب کی تائید کی ہی اور وجاہت علی نے اس اخبار کے مدیر کو جو خط لکھا ہی، اس میں بھی سید صاحب کے خیالات کو سراہا ہی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہی کہ ہندستانیوں کو کسی طرح انگریزوں کے مقابلے میں کم تر اور پست نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ ایسے بہت سے ہندستانی موجود ہیں جو کسی اعتبار سے بھی انگریزوں سے تعلیم و اخلاق میں کم نہیں ہیں۔ یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسے ہندستانیوں کی تعداد بہت محدود ہی حالاں کہ انگلستان میں ایسے انگریزوں کی تعداد بہت زیادہ ہی جن کی تعلیم اور جن کے اخلاق کا معیار بلند ہی۔ سید صاحب کے خیالات کی تائید یا تنقید کے ضمن میں ضروری ہی کہ موصوف کے ذاتی تجربے کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

---

[۱] علی گڑھ اخبار۔ ۳۱ مارچ ۱۸۷۱ء

سید صاحب نے شملہ، کان پور اور امرت سر کے سفر کے دوران میں مقامی انگریز حکّام سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ہر جگہ انگریز حکام نے نہایت خوش خُلقی سے سید صاحب کی درخواست کا جواب دیا۔ لیکن اس کے برخلاف سید صاحب نے اسی طرح کی ملاقات کی درخواست چار دیسی رئیسوں سے کی تو ان میں سے کوئی اخلاق سے پیش نہ آیا۔ پھر اس کے بعد اور تین سے ملاقات کی درخواست کی۔ ان میں سے ایک نے اپنے ملازم کے ہاتھ زبانی جواب کہلا بھیجا کہ کل صبح تشریف لائیے۔ دوسرے نے لکھا کہ فلاں وقت آئیے ورنہ کسی دوسرے وقت ملنا ممکن نہیں۔ تیسرے صاحب نے جواب دیا کہ دوسرے مشاغل کے باعث ملنا ممکن نہیں ہے۔

یہ خط جس کا تجزیہ میں نے یہاں پیش کیا ہے، تین کالموں میں ہے۔ اس پر مدیر نے اپنے تین کالم لکھے ہیں جن میں کم و بیش وہی مضمون پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں ہندستانی رئیسوں کی خوب خبر لی گئی ہے اور ان کے غرور اور نکمّے پن کو صاف صاف بیان کیا ہے۔ ان کا برتاؤ اُن لوگوں سے جو دولت یا معاشرتی رتبے میں ان سے کم تر ہوتے ہیں، اچھا نہیں ہوتا، چاہے وہ لوگ علم و فضل اور اپنی نیک اعمالی کے باعث ان سے بلند تر مرتبہ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ یہی لوگ جو اہلِ علم و فضل سے ملنے میں اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں، بجائے اچھوں کی صحبت کے احمقوں اور مسخروں کی صحبت میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اچھوں کی صحبت میں رہیں تو ان کی نصیحتوں اور مشوروں سے مستفید ہو سکیں۔

اِس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ سیّد احمد خاں نے اپنے ہم مذہبوں سے اپیل کی ہی کہ وہ بھی ان کی طرح اپنے بچّوں کو تعلیم و تربیت کے لیے انگلستان بھیجیں بالخصوص وہ جو متموّل ہیں اور معاشرہ میں حیثیت رکھتے ہیں۔ سیّد صاحب نے "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۲۷ جنوری ۱۸۷۱ء میں ایک مضمون میں بتایا ہی کہ مسلمانوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر ان کے بچّے عیسائیوں کے ساتھ رہیں گے تو کوئی چیز مانع نہیں کہ وہ اپنے مذہب کے پابند نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ایک خط انھوں نے اپنے صاحب زادے کا بھی نقل کیا ہی۔ یہ خط اصل میں ہندستانی زبان ہی میں لکھا گیا ہی، ترجمہ نہیں ہی۔ اس خط میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے بتایا گیا ہی کہ ہم لوگ روزہ نماز کی ولایت میں رہ کر بھی پابندی کر سکتے ہیں اور شراب، جُوے اور سُور کے گوشت سے احتراز کر سکتے ہیں۔ اس خط میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے مسلمان والدین کو پورا اطمینان ہونا چاہیے کہ ان کے بچّوں کا دین ایمان ولایت جانے سے خطرے میں نہیں پڑ جاتا۔ وہ انگریزوں کی رواداری اور خوش اخلاقی پر بھروسا کریں تو انھیں اپنے بچّوں کو انگلستان بھیجنے میں کوئی تامّل نہ ہونا چاہیے۔ وہ سیّد احمد خاں کی آزاد خیالی کا تتبع کر سکتے ہیں جن کی عزت نہ صرف مسلمانوں کے دل میں ہی بلکہ اہلِ یورپ بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔

ہندستان میں ادبی اور علمی انجمنیں اہلِ ہند کی ذہنی ترقی میں ممد و معاون ہیں۔ بالخصوص ان لوگوں کے لیے یہ انجمنیں بڑی دل چسپی اپنے اندر رکھتی ہیں جو تعلیم یافتہ ہیں۔ بہ قول فارسی شاعر کے:

بنی آدم از علم یابد کمال
نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

کلکتہ میں ابھی حال میں ایک انجمن قائم ہوئی ہی جس کا نام "اہلِ ہند کی اصلاح کی انجمن" (انڈین ریفارمیشن سوسائٹی) ہی۔ اس انجمن کا یہ مقصد ہی کہ اہلِ حاجت کی امداد کی جائے، متوسط طبقے کے لوگوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور صنعت و حرفت کی ہر طرح ہمت افزائی کی جائے۔ تمام تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال ہندستانی شوق سے اس انجمن کی رکنیت قبول کر رہے ہیں اور اپنے چندے داخل کر رہے ہیں تاکہ انجمن کو اپنے مقاصد کے حاصل کرنے میں تھوڑی بہت امداد ملے۔ مغل سرائے کی ادبی مجلس کے سب ارکان اس انجمن میں شریک ہو رہے ہیں۔ توقع کی جاتی ہی کہ دوسری ادبی اور علمی انجمنوں کے ارکان بھی اس انجمن میں شرکت کریں گے۔[1]

کلکتے کی مسلمانوں کی مجلسِ ادبی کے علاوہ جس کی نسبت میں پیش تر متعدد مرتبہ ذکر کر چکا ہوں، دسمبر ۱۸۷۰ء میں بنارس میں بھی ایک انجمن سید احمد خاں کے مقاصد کے تحت قائم ہوئی ہو جس کا نام "کمیٹی خواستگاران ترقیٔ تعلیم مسلمانانِ ہندستان" رکھا گیا ہی۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہو کہ مسلمانوں کے قدیم علوم کا احیا مغربی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ جاری رہنا چاہیے۔ اس کے لیے انجمن کی طرف سے مسلمان مصنفین کے لیے انعام مقرر کیے جائیں گے جو مسلمانوں کے قدیم علوم پر اپنی تحقیقات شایع کریں گے۔ ۶ جنوری ۱۸۷۱ء کے

---

[1] علی گڑھ اخبار ۱۰ فروری ۱۸۷۱ء

"علی گڑھ اخبار" میں اس انجمن کے قواعد شایع ہوئے ہیں۔ ارکان کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ سب مسلمان ہوں لیکن وہ انگریز بھی شریک ہوسکیں گے جو مسلمانوں کی علمی اور ادبی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کے متمنی ہیں۔ اسی اخبار میں ان ارکان کے نام درج ہیں جو اس انجمن کے اب تک رکن بن چکے ہیں۔ سید احمد خاں اس کے معتمد ہیں۔ اس اخبار میں ان مضمونوں کی بھی فہرست درج ہے جن کے متعلق انجمن مضامین لکھوانے والی ہے۔ آیندہ اس اخبار میں انجمن کی کارروائیوں اور جلسوں کی روداد عام اطلاع کی غرض سے شایع ہوا کرے گی۔

۹ ستمبر ۱۸۷۱ء کے "علی گڑھ اخبار" میں بنارس کی مذکورۂ بالا انجمن کی ذیلی کمیٹی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے ذمے یہ کام ہے کہ وہ اُردو کی تمام کتابوں کی چاہے وہ اصل ہوں یا ترجمے ہوں مطبوعہ ہوں یا غیر مطبوعہ ایک مضمون واری فہرست تیار کی جائے جس میں مختصر طور پر کتاب اور مصنف یا مترجم کا نام ہوگا۔ ایسی کتابوں کی علاحدہ فہرست تیار کی جائے گی جو دست یاب ہوسکتی ہیں اور ان کی علاحدہ جو دست یاب نہیں ہوسکتیں۔ وہ کتابیں علاحدہ رکھی جائیں گی جو یونی ورسٹیوں کے امتحانات میں کام آتی ہیں۔ ذیلی کمیٹی کی تمام کارروائیاں بعد میں انجمن کے عام جلسے میں پیش ہوں گی جو ہر کام کے متعلق قطعی فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا۔ انجمن ان اسباب کی تحقیق کرے گی جن کے باعث سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبا کی تعداد کم ہے۔ اس کے اسباب کی بھی تحقیق کی جائے گی کہ مسلمانوں کے قدیم علوم کیوں کس مپرسی میں پڑے ہوئے ہیں اور جدید علوم کی طرف

انھوں نے اب تک کیوں توجہ نہیں کی ہے۔ ان موضوعوں پر بہترین مضامین لکھنے والوں کے لیے تین انعام بھی رکھے گئے ہیں۔ ایک ۵۰۰ روپے کا، ایک ۲۰۰ کا اور ایک ۵۰ روپے کا۔ یہ مضمون ہندستانی زبان میں ہونے چاہییں اور معتمد انجمن کے نام بھیجے جائیں۔ مضمون نگاروں کے لیے مسلمان ہونا لازمی ہے۔ ان مضامین کے اچھے بُرے ہونے کا فیصلہ ایک خاص کمیٹی کرے گی جو اسی غرض کے لیے مقرر کی جائے گی۔ ان مضامین میں اصلاحِ حال کے جو مشورے دیے جائیں گے ان کو انجمن کی ذیلی کمیٹی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی۔

لکھنؤ کی انجمنِ تہذیب بدستور اچھی حالت میں ہے۔ اس میں بعض نہایت قابلِ قدر لوگ شریک ہیں۔ اس کے ارکان میں نواب شجاع الدولہ کے ایک پوتے بھی ہیں جن کا نام مرزا امام علی خان ہے۔ اس انجمن کے معتمد بابو شیو نارایَن نے سالانہ رپوٹ بابت ۱۸۷۰ء انجمن کے ماہ وار رسالے میں شایع کی ہے۔ اس رپوٹ میں ان تمام کارروائیوں کی روداد شامل ہے جو انجمن کے مقاصد کے حصول کے لیے کی گئیں۔ رپوٹ میں اس بات کی یاددہانی کی گئی ہے کہ انجمن ۱۸۶۸ء میں ایک درجن ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعاونِ عمل سے وجود میں آئی۔ انجمن کے ان اصلی بانیوں کے نام بھی درج ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے علم و فضل کے باعث شہرت رکھتا ہے۔ اس کا پہلا جلسہ ۹ فروری ۱۸۶۸ء کو منعقد ہوا۔ اس چار سال کے عرصے میں انجمن نے بہت ترقی کی ہے اور اب اس کی بنیادیں مضبوط ہو گئی ہیں۔ حکومت نے بھی اس کی مدد کی اور انفرادی طور پر اس کے لیے چندے جمع کیے گئے جن کی بدولت اس کا کام

چلتا رہا۔
انجمن اپنے اصلاحی خیالات کی نشر واشاعت کے لیے تین ذرائع اختیار کرتی ہے۔ یہ معمولی اور غیر معمولی جلسے منعقد کرتی ہے، رسالے شائع کرتی ہے اور اپنے کتب خانے کے ذریعے لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ معتمد نے انجمن کے جلسوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ گزشتہ سال ۱۹ موضوعوں پر مقالے پڑھے گئے۔ ایک مقالے کا عنوان "حقوقِ انسانی" تھا۔ یہ عنوان ہندستانی سے زیادہ امریکی رنگ کا ہے۔ اس پر بابو رام چندر نے مقالہ پڑھا۔ ایک دُوسرا مقالہ بابو سنن سنگھ نے "ہندستان کی گزشتہ اور موجودہ حالت" پر پڑھا۔ مجھے یہ عنوان نسبتاً زیادہ پسند ہے۔ ایک اور مقالہ مولوی امام اشرف نے "مسلمانوں میں سائنس کی ترقی" پر پڑھا تھا۔ مَیں یہاں اُن دوسرے مقالوں کا ذکر غیر ضروری سمجھتا ہوں جو ہم لوگوں کے لیے باعثِ دل چسپی نہیں ہیں۔

"انجمنِ تہذیب لکھنؤ" کے ۱۵ دسمبر ۱۸۷۰ء کے جلسے میں مولوی مسیح الدین خان نے انگلستان کی سیاسی قوت پر ایک مضمون پڑھا۔ موصوف ایک زمانے میں انگلستان میں نوابِ اودھ کے سفیر تھے۔ یہ مضمون نہایت مفید اور دل چسپ تھا اور حاضرین نے بہت پسند کیا۔ مضمون کے ختم ہونے کے بعد صدرِ جلسہ نے لائق مقرر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ قدیم زمانے میں ہندستان کے بادشاہ مطلق العنان ہوا کرتے تھے۔ چناں چہ جب ہندستانیوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ انگلستان کی حکومت نیم شاہی اور نیم جمہوریت ہے اور یہاں کے بادشاہ مرّوجہ قانون کی خلاف ورزی کے مجاز نہیں ہوتے تو

انھیں بڑا تعجب ہوا۔ انھیں تعجب اس پر تھا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہوں۔ مولوی مسیح الدین کے اس مضمون سے لوگوں کو انگلستان کے بادشاہ کی دستوری حیثیت کے متعلق علم ہوگا اور انھیں معلوم ہوگا کہ باوجود محدود ہونے کے اس کے اختیارات بہت وسیع ہیں۔

انجمن کے جلسوں میں جو تجاویز منظور ہوئی ہیں اور جن امور پر بحث ہوئی ہے ان کے متعلق معتمدِ انجمن نے حکومت کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ زیادہ تر یہ امور عام اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تفصیل معتمد کی رپوٹ میں موجود ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ حکومت ان تمام امور پر ہمدردانہ غور کرے گی۔ ان میں سے چند یہ ہیں: تعلیم عامہ کی سہولتیں؛ لکھنؤ میں ایک پبلک کتب خانے کا قیام، گانویں ڈاکٹروں کا تقرر وغیرہ۔

اس کے بعد معتمد نے اپنی رپوٹ میں ان اخبارات کی فہرست درج کی ہے جو انجمن میں آتے ہیں۔ ان میں ۳۴ ہندستانی ہیں۔ بعض روزانہ، بعض ہفتے وار اور بعض ماہ وار۔ دس انگریزی کے اخبار آتے ہیں جن میں "دی ہندو پیٹریٹ" The Hindu Patriot "دی وئس آف انڈیا" The Voice of India اور "دی پانیر گزٹ" The Pioneer Gazette شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن میں پنجاب، بریلی، میرٹھ اور سیتاپور کی علمی اور ادبی انجمنوں کی مطبوعات آتی ہیں۔ انجمن کو توقع ہے کہ عنقریب اُن سب انجمنوں کی مطبوعات جو ہندستان کے مختلف شہروں میں حال میں قائم ہوئی ہیں، اس کے اندر آنے لگیں گی۔

جو اخبار اور رسالے انجمن میں آتے ہیں وہ پہلے انجمن کے دفتر میں کچھ روز رکھے جاتے ہیں پھر اس کے بعد مختلف ارکان کو بھیج دیے جاتے ہیں۔ ہر اخبار کو کم از کم بارہ اشخاص ضرور پڑھتے ہیں۔ رپوٹ لکھنے کے وقت کتب خانے میں کئی ہزار کتابیں موجود تھیں جن میں سے تقریباً سو خریدی ہوئی تھیں اور باقی انجمن کو تحفتاً دی گئی تھیں توقع کی جاتی ہے کہ عنقریب کتب خانے کی کتابوں میں اضافہ ہو گا۔ لوگ کچھ تحفتاً کتابیں دیں گے اور اس کے ساتھ انجمن اپنے ارکان کے چندوں سے اس قابل ہوسکے گی کہ خود بھی کچھ کتابیں خریدے۔

بعض لوگ اعتراضاً کہتے ہیں کہ بھلا انجمن قائم کرنے سے کیا فائدہ ہوا۔ انجمن کے معتمد نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انجمن کی مساعی اور اس کے نتائج کا حال سالانہ رپوٹ سے بہ خوبی معلوم ہوسکتا ہے اور نتائج تو دراصل آیندہ برآمد ہونے کی توقع ہے جن کی تیاری انجمن کی موجودہ کارروائیوں کے ذریعے عمل میں آرہی ہے۔

انجمن نہایت احتیاط اور دانش مندی سے اپنا کام کر رہی ہے۔ اگر انجمن کسی معاملے میں انتہاپسندی اختیار کرے گی تو یہ اس کی بڑی غلطی ہوگی۔ پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ انجمن اپنے ارکان کی شخصی زندگی کو بہتر بنانے کی طرف توجہ کرے پیشتر اس کے کہ حکومت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جائے۔ اس باب میں انجمن اپنے حدود میں رہ کر جو کچھ کر سکتی ہے، وہ کر رہی ہے اور حکومت اس کے جوشِ عمل اور خلوص کی پوری طرح قدر کرتی ہے۔

بہ ہر نوع ایک ایسی انجمن کا وجود بجائے خود جہاں تھوڑا سا چندہ دے کر پڑھے لکھے لوگ. جو علم و ترقی کو عزیز رکھتے ہیں، آپس میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں. جلسے منعقد کر سکتے ہیں، اخبارات سے دنیا کا حال معلوم کر سکتے ہیں اور کتابوں کے مطالعے سے اپنے علم میں اضافہ کر سکتے ہیں. یہ انجمن صرف اودھ کے صدر مقام کے لیے ہی باعثِ برکت نہیں ہے بلکہ سارے ہندستان کے لیے عزت کا موجب ہے. لکھنؤ کی "انجمنِ تہذیب" کی دیکھا دیکھی سیتاپور اور کان پور میں بھی اسی نوعیت کی انجمنیں قائم ہو گئی ہیں۔

اودھ کے ناظمِ تعلیمات مسٹر کولن براؤننگ نے جو سالانہ رپوٹ مجھے بھیجی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جبل پور میں تین ادبی اور علمی انجمنیں کام کر رہی ہیں. ادبی انجمن جس میں مباحثے بھی ہوا کرتے ہیں ۱۸۶۸ء میں قائم کی گئی تھی. ایک طبّی انجمن ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ طبّی معلومات کو پھیلایا جائے. اس انجمن میں دیسی ڈاکٹر شریک ہیں. ایک انجمن اشاعتِ علوم کے لیے ہے جس کے صدر مولوی صفدر علی ہیں جو ایک صاحبِ شہرت شخص ہیں اور مہتمم تعلیمات ہیں. اس انجمن کے جلسوں میں جو مضامین پڑھے گئے ان کی روداد پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں انجمن کے بیس ارکان نے اُردو یا ہندی کی نظمیں پڑھیں۔

رائے پور میں بھی ایک انجمن ہے جس کا مقصد مفید معلومات کی نشر و اشاعت ہے. صرف اودھ میں لکھنؤ کی "انجمنِ جلسۂ تہذیب" کے ماسوا تین اور انجمنیں ہیں. ایک گونڈہ میں ایک فیض آباد میں

اور ایک پرتاب گڑھ میں۔ گونڈہ والی انجمن کا نام "انجمنِ رفاہ" ہی۔ علی گڑھ میں ایک "انجمنِ اخلاق" قائم کی گئی ہی۔ اس کے ایک جلسے میں اس کے معتمد درگا پرشاد نے انجمن کے مقاصد پر بہت دل چسپ مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ "علی گڑھ اخبار" کی ۳۰ جون ۱۸۷۱ء کی اشاعت میں شایع ہوا ہی۔ شاہ جہاں پور میں ایک "انجمنِ اصلاح" ہی جس میں معاشرتی اصلاح کے متعلق تدابیر سوچی جاتی ہیں۔ کلکتہ کے قریب بارہ نگر میں ایک "انجمن اصلاح معاشرت" قائم کی گئی ہی جس کی بانی مس کارپنٹر ہیں جو بہت قلیل عرصے کلکتہ میں رہیں اور جن کی مساعی جمیلہ کی نسبت "انڈین ایسوسی ایشن" کی اشاعتوں میں آپ کو تفصیلی ذکر ملے گا۔ بے ہولا کی انجمن کا نام improvementsociety (انجمنِ اصلاح و ترقی) ہی۔ اعظم گڑھ میں مولوی قربان علی مہتمم مدارس نے ایک مجلسِ مباحثہ قائم کی ہی تاکہ عام طور پر لوگ اس میں شرکت کر سکیں۔ اس میں ادبی اور علمی جلسے منعقد ہوتے ہیں اور اس انجمن کی علاحدہ علاحدہ خاص کمیٹیاں ہیں۔ مولوی قربان علی نے جیل پور میں اس سے قبل ایک انجمن کی بنا ڈالی تھی جس کا مقصد معاشرتی اصلاح تھا۔ یہ انجمن بہت مفید ثابت ہوئی۔ ہمیں توقع ہی کہ نئی انجمن بھی ترقی کرے گی اس لیے کہ اس کے ارکان میں خلوص اور جوش موجود ہی۔ انجمن کی ابتدا سے شہر کے ذی وجاہت اور علم دوست حضرات جنھیں علوم و فنون سے کچھ لگاؤ ہی، اس میں شرکت کر رہے ہیں۔ راجا محمد سلامت خان اس کے صدر اور مولوی قربان علی جو اس کے بانی بھی ہیں، معتمد مقرر ہوئے ہیں۔ انجمن کے پہلے جلسے

ہیں جلسوں کے انعقاد کے متعلق قواعد و ضوابط منظور کیے گئے۔ پھر اس پر غور کیا گیا کہ جلسوں میں کس قسم کے موضوعوں پر بحث و مباحثہ ہوا کرے۔ طے یہ ہوا کہ پہلے تعلیمِ نسواں کے مسئلے پر بحث ہونی چاہیے۔[۱]

نینی تال کی انجمن اپنی ادبی اور اخلاقی خدمات میں مشغول ہے۔ گزشتہ اگست کے ایک جلسے میں ایک مسلمان فاضل نے عقدِ بیوگان پر ایک مقالہ پڑھا اور اس ضمن میں اسلام میں مردوں اور عورتوں کی مساوات کا بھی ذکر کیا۔ لیکن مقالہ نگار نے عربی، فارسی کے ایسے مغلق الفاظ اپنے مضمون میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر استعمال کیے تھے کہ جلسے کے صدر پنڈت گنگا دت نے مقالہ نگار کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کرائی کہ آیندہ وہ عام فہم اور سادہ زبان لکھنے کی کوشش کریں۔ سر ولیم میور بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ انھوں نے جلسے کے آخر میں انجمن کو مبارک باد دی اور توقع ظاہر کی کہ وہ آیندہ مزید خدمات کر سکے گی۔ موصوف نے دورانِ تقریر میں یہ بھی کہا کہ مقالہ نگار نے جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے وہ صرف نظریے کی حد تک نہیں رہنی چاہییں بلکہ ان پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ صدر کی طرح انھوں نے بھی توقع ظاہر کی کہ مقالوں میں ایسی آسان زبان استعمال کرنی چاہیے جو ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آ سکے نہ کہ ایسی مشکل زبان جو صرف چند عالم لوگ سمجھ سکیں۔

بہار کی ادبی اور علمی انجمن اس غرض کے لیے مظفر پور میں قائم کی گئی ہے کہ اہلِ ہند میں مغربی تعلیم کی نشر و اشاعت کرے۔

---

[۱] علی گڑھ اخبار، مورخہ ۱۶ جون ۱۸۷۰ء

اس انجمن نے مجھے اپنا اعزازی رُکن منتخب کرکے میری عزّت افزائی کی ہے۔ یہ تعلیم مروّجہ زبان میں، جو اس علاقے میں سمجھی جاتی ہے، دی جائے گی اور ہندُستان کی قدیم زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ اس انجمن کے ارکان کی تعداد تین سو تک پہنچ چکی ہے۔ اس وقت اس کے پاس دس ہزار رُپے کا سرمایہ موجود ہے جو چندوں اور عطیوں سے ملا ہے۔ انجمن کی طرف سے ایک فاضل شخص کو تین سو رُپے ماہ وار تنخواہ دی جاتی ہے جس کے ذمّے یہ کام ہے کہ وہ انگریزی زبان سے ہندستانی میں ایسی کتابوں کا ترجمہ کرے جو طلبا کے کام کی ہوں۔ اس انجمن کی پانچ شاخیں ہیں۔ ایک شاخ مظفرپور میں ہے جس کا نام "انجمنِ تہذیب" ہے۔ یہ انجمن بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ اس کی طرف سے ایک کالج قائم ہے جس میں سو کے قریب طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ اِس کالج میں ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہے۔ عربی، فارسی اور یورپین سائنس کے مبادیات کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس کا بھی اہتمام ہے کہ روزمرّہ کی زبان میں مختلف مضامین طلبا کو پڑھائے جائیں۔ اس انجمن کا تیسرا سالانہ جلسہ گزشتہ سال ۲۴ مئی کو منعقد ہوا تھا جس سے اس کی زندگی کے چوتھے سال کا آغاز ہوتا ہے۔ اس جلسے کی وہی تاریخ رکھی گئی جو ملکۂ وکٹوریہ کی پیدایش کی تاریخ ہے جب کہ تمام انگریزی علاقوں میں جشن منایا جاتا ہے۔ اس جلسے میں دو سو سے زائد اشخاص نے شرکت کی۔ ان میں ریورنڈ جے لانگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موصوف اہلِ ہند کے

سچے اور پکے دوست ہیں اور پورٹ رویال Port Royal کے درویشوں کے بڑے مدّاحوں میں سے ہیں[۵]۔ اس موقع پر ہندستانی زبان میں متعدد تقاریر ہوئیں۔ انجمن کے معتمد مولوی سید امداد علی نے انجمن کی کارگزاری پر تبصرہ کیا اور بتایا کہ اس کا مقصد یہ ہو کہ علم و ادب کی خدمت کرے اور اس کا اصول اب تک یہ رہا ہو کہ اپنے یہاں کی تقاریر اور تحریروں میں حتّی المقدور مذہبی مسائل کو نہ چھیڑا جائے۔ یہی اصول انجمن کے اخبار "اخبار الاخیار" کی اشاعت میں بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

مغل سرائے کی ادبی انجمن معاشرتی مسائل کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں ہو۔ عقدِ بیوگان، تعددِ ازدواج اور لڑکوں اور لڑکیوں کی فروخت وغیرہ کے متعلق وہ لوگوں میں صحیح خیالات کی نشر و اشاعت کر رہی ہو۔ اس انجمن کے ایک جلسے میں بابو دینا ناتھ نے، جن کے متعلق میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، اشاعتِ تعلیم کے متعلق ایک عالمانہ تقریر کی۔ "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۱ء میں اس تقریر کے اقتباسات دس کالموں میں درج ہیں۔ بابو صاحب نے اپنے اہلِ وطن کو مبارک باد دی کہ ان کی بعض تقاریر اور مقالے ایسے تھے جو اہلِ یورپ کے معیار سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ یہ بات باعثِ فخر ہو کہ ان کے درمیان

---

[۵] پورٹ رویال فرانسیسی درویشوں کی مشہور خانقاہ تھی جہاں بعض اہلِ علم نے ترکِ دنیا کر کے سکونت اختیار کر لی تھی۔ پاسکال اور آرنو وغیرہ کی تصانیف یہیں لکھی گئیں۔ سیاسی وجوہ کی بنا پر ۱۷۱۰ء میں لوئی چہار دہم کے حکم سے اس خانقاہ کو بند کر دیا گیا۔ (مترجم)

اعلا درجے کے خطیب اور بلند پایہ اخبارات کے مدیر موجود ہیں لیکن ان کی تعداد بہت محدود ہی۔ یہ ستارے مغرب کے سورج سے اپنی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہندستانی لوگ نہایت ذہین ہوتے ہیں لیکن ابھی انھیں اہلِ یورپ سے بہت کچھ سیکھنا ہی جن کی برتری مسلّم ہی۔ اہلِ ہند کو چاہیے کہ وہ صرف یونی ورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کرنے کے متمنّی نہ ہوں بلکہ انھیں دنیا کے تمام مسائل سے دل چسپی رکھنی چاہیے اور اپنے اخلاق کو بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں مبلّغینِ مسیحیت کی بابو صاحب نے تعریف کی کہ وہ اہلِ ہند کو تعلیم دے رہے ہیں اگرچہ ان کے مذہبی عقائد کے خلاف اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔ وہ طلبا جو ان مسیحی مدارس میں تعلیم پاتے ہیں ان سے مختلف ہوتے ہیں جو سرکاری مدارس میں پڑھتے ہیں۔ آخرالذکر اکثر ہندو مذہب سے بیزار ہوجاتے ہیں اور تشکیک اور عقلیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بابو صاحب نے یورپ کے بعض صاحبِ فکر لوگوں کی طرح طریقِ امتحانات کی خرابیاں واضح کیں۔ ان امتحانات میں صرف حافظے کی جانچ کی جاتی ہی نہ کہ ذہانت کی۔ طلبا کو جو انعامات دیے جاتے ہیں ان میں ایسے انعام بھی ہونے چاہییں جو اچھے اخلاق وعادات کے لیے دیے جائیں۔ بابو صاحب نے ان ہندستانیوں کی بُرائی کی جو انگریزی زبان سیکھنے کے بعد صرف قصّے اور ناول پڑھا کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابو صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی

کہ اہلِ ہند کو چاہیے کہ ہر گاؤں اور ہر شہر میں انجمن ہائے اصلاح قائم کریں جہاں اخلاقی موضوعوں پر مقالے پڑھے جائیں اور بحث مباحثہ ہو۔ اہلِ ہند کی بے سوچے سمجھے انگریزوں کی اندھی تقلید کو بُرا بتایا گیا۔ صرف اس بنا پر انگریزوں کی تقلید نہیں کرنی چاہیے کہ وہ حاکم قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے رسم و رواج اہلِ ہند کی روایات سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً شراب اور گوشت کا استعمال ہندوؤں کے مذہب کے بالکل خلاف ہے جو انگریزوں میں پایا جاتا ہے۔ دراصل کوشش اس کی ہونی چاہیے کہ انگریزوں کی اچھی صفات کی تقلید کی جائے جن کے باعث انھیں فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ تعلیم پر کتب شائع جائیں اور بڑے بڑے لوگوں کے سوانح لکھے جائیں تاکہ ان کی سیرت کے اعلیٰ خد و خال ظاہر ہوں اور زندگی کے مختلف حالات میں دوسروں کے لیے باعثِ رہبری ہوں۔

اسی جلسے میں بابو ابکا چرن چٹرجی نے ایک مقالہ پڑھا جس کی سب حاضرین نے بہت تعریف کی۔ اس مقالے میں یہ بات ظاہر کی گئی کہ ہندو لوگ بہت مغرور ہیں اور یہی عیب ان کے سماج کی معاشرتی خرابیوں کا اصلی سبب ہے[1]

علی گڑھ اخبار، مورخہ ۲۲ جون ۱۸۷۱ء میں اخبار 'پانیر' کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا پور کے رئیسوں کا ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ اس شہر میں ایک انجمن قائم کرنی چاہیے جس میں سیاسی اور علمی مسائل پر بحث مباحثے ہوا کریں۔

---

[1] علی گڑھ اخبار، مورخہ ۱۰ از ۱۷ مارچ ۱۸۷۱ء

مہنت جے رام گرو نے جلسے کا افتتاح کیا اور پنڈت رادھا کرشن نے اپنی تقریر میں جلسے کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ انجمن کے قائم ہونے سے اہلِ شہر کو بہت فائدہ ہوگا۔ یہ انجمن اسی نوعیت کی ہوگی جیسی بنارس، علی گڑھ، شاہ جہاں پور اور مُرادآباد میں انجمنیں قائم ہوئی ہیں۔ جب پنڈت تقریر ختم کر چکے تو بعض حاضرین نے اس تجویز کی موافقت کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ انجمن کا نام "مرزا پور سوسائٹی" رکھا جائے گا۔ پندرہ روز بعد انجمن کا پھر جلسہ منعقد ہوگا جس میں قواعد وضوابط بنانے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے گی[۱]

لندن کی "انجمنِ فنون" کے گزشتہ مارچ کے جلسے میں مسٹر ہائڈ کلارک نے تجویز پیش کی تھی کہ ایک "مشرقی کانگرلیس" قائم کرنی چاہیے جو خاص طور پر ہندستان کے مسائل سے دل چسپی رکھے اور جس کے جلسے باری باری سے انگلستان کے مختلف بڑے صنعتی شہروں میں منعقد ہوا کریں۔ اس کے جلسوں میں ایسے موضوعوں پر تقریروں اور مقالوں کا انتظام ہوگا جن سے ہندستان کے مادی وسائل کے متعلق معلومات میں اضافہ ہو اور اس ملک کی سیاسی اور معاشرتی حالت سُدھارنے کی تدابیر پیش کی جائیں۔ علمِ طبقات الارض، زراعت، علمِ حیوانات اور لسانیات کے متعلق خاص طور پر مقالے لکھے جائیں گے۔ مسٹر برنارڈ کواررش نے جو ایک مستشرق ہیں۔ اس تجویز کی پُر زور تائید کی اور کہا کہ

---

[۱] علی گڑھ اخبار۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۸۷۱ء

اگر اس پر عمل کیا گیا تو ہندستان کی مختلف زبانوں کی تحقیقات کو ترقی ہوگی۔ موصوف نے نہایت تفصیل سے ان زبانوں اور خاص کر ہندستانی سیکھنے کے فوائد بیان کیے۔ بعض اور دوسرے مقرروں نے نہایت مفید باتیں کہیں اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ مجوزہ "مشرقی کانگریس" کو جلد از جلد قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بعض مشہور ہندو شادی کے متعلق ان رسوم کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جن کے سبب سے اُن کے ہم مذہب لوگوں کو فضول خرچی کی عادت پڑتی ہے۔ ان کی مخالفت سے اب یہ رسوم کم ہو رہی ہیں۔ ضلع جون پور میں ایک جلسہ ۱۰ دسمبر ۱۸۷۰ء کو زیرِ صدارت سر ولیم میور منعقد ہوا تھا جس میں صدر نے ہندستانی زبان میں تقریر کی اور شادی کے موقع پر فضول خرچی کی بُری رسم کی خرابیاں بیان کیں۔ صدر کی تقریر کے بعد اسی مضمون کی چند اور تقریریں ہوئیں۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ ان تقریروں کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلے گا اور اس انجمن کے ارکان جن خراب رسوم کو مٹانا چاہتے ہیں وہ بہت جلد ہندو سماج میں باقی نہیں رہیں گی۔

کلکتہ میں ایک "زنانہ سوسائٹی" قائم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ طبقۂ نسواں میں ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔ اس انجمن کا ایک جلسہ ۹ جون کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں اُن خواتین نے جو اس انجمن کی ارکان ہیں، اُن طریقوں پر غور کیا جن پر عمل کرنے سے اُن عورتوں کو تعلیم کے فوائد سے

بہرہ ور کیا جا سکے جو پردہ نشین ہیں۔[1]

اِن مختلف انجمنوں میں جن کی نسبت میں نے ذکر کیا ہے، یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اگرچہ مسلمان ہندستان میں اقلیت میں ہیں لیکن وہ خاصے پیش پیش نظر آتے ہیں اور اکثر اوقات اِس قسم کے جلسوں میں ان کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ خواہش موجود ہے کہ وہ انجمنوں سے پورا فائدہ اُٹھائیں اور جدید تہذیب و تمدن میں ترقی کریں۔

اس کی ضرورت ہے کہ اہلِ ہند کی ترقی کی راہ پر گام زن ہونے کے لیے ہر طرح ہمت افزائی کی جائے۔ یورپین لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی ہر طرح امداد کریں۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سنہ ۱۸۷۰ء میں 'برسٹل' میں ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا نام "ہندستان کی معاشرتی ترقی کی قومی انجمن" ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں ہماری صدی کے سب سے بڑے ہندو مُصلح راجا رام موہن رائے نے انتقال کیا۔ اس انجمن کا قیام راجا رام موہن رائے کے جانشین بابو کیشب چندر سین کے دورانِ قیام میں عمل میں آیا۔ اس انجمن کا ایک ماہ وار رسالہ یکم جنوری سنہ ۱۸۷۱ء سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس انجمن کی بانی اور روحِ رواں مس کارپنٹر نے از راہِ کرم اس رسالے کا ایک نسخہ مسز مگنین کے توسط سے مجھے بھیجا ہے۔ اس رسالے میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ انجمن کن ذرائع سے اہلِ ہند کی معاشرتی بہتری کرنا چاہتی ہے۔ چناں چہ

---

[1] اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۲۳ جون سنہ ۱۸۷۰ء

اس ضمن میں تین ذرائع پیش کیے گئے ہیں:(۱) اہلِ ہند میں تعلیم کا رواج بڑھانا اور ان کی اخلاقی زندگی کو سدھارنا (۲) ہندستان کے متعلق صحیح حالات انگریزوں کو بتانا اور اس ملک میں ان کی دلچسپی پیدا کرانے کی تدابیر کرنا (۳) اُن ہندستانی لوگوں سے تعاونِ عمل کرنا جو اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس رسالے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کچھ نہ کچھ کام کیے جارہی ہے۔ انجمن نے بمبئی اور کراچی کے مدارس کے لیے ہر قسم کی مفید اشیا بھیجی ہیں تاکہ یورپین چیزوں کے متعلق طلبا کی واقفیت میں اضافہ ہو۔ ان میں جغرافیے کے نقشے اور مختلف قسم کی تصاویر شامل ہیں۔ اس انجمن نے اہلِ ہند کی اب تک جو خدمت کی ہے اور جو آیندہ اس سے توقعات وابستہ ہیں، ان کا اظہار ہندستان کے مشہور وکیل مسٹر آئی۔ ٹی پریچرڈ نے اپنی گزشتہ ۱۴ اپریل والی تقریر میں بہ خوبی کیا تھا۔ یہ تقریر ایک بہت بڑے جلسے کے رُو بہ رُو کی گئی۔ ان کے علاوہ چار مسلمان اور ایک ہندو مقرر نے اپنی تقریروں میں انجمن کی خدمات نہایت تفصیل سے بیان کیں۔

اس انجمن کے علاوہ لندن اور ویلز اور شمالی انگلستان کے مختلف شہروں میں اسی قسم کی انجمنیں قائم ہوئیں جن کا مقصد اہلِ ہند میں تعلیم کو فروغ دینا خاص کر تعلیمِ نسواں کو بڑھانے کی تدابیر کرنا ہے۔ اگر اس مقصد میں کام یابی ہوتی تو اہلِ ہند کی آیندہ نسلیں روشن خیال ہو جائیں گی اور بہت سی رسُومِ قبیحہ اور توہمات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بعض انجمنیں اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ

اہلِ ہند کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر کریں۔ اہلِ ہند کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ اُنھیں اس کا موقع حاصل ہو کہ وہ ہمارے بڑے بڑے تمدنی مرکزوں کی زندگی کا مشاہدہ کریں[1]۔ لندن کی انجمن نے اس کا انتظام کیا ہے کہ جو ہندستانی لوگ اپنے بچوں کو انگلستان تعلیم کی غرض سے بھیجیں انھیں ہر طرح کی سہولتیں میسر آئیں اور ان کی نگرانی کا اہتمام کیا جائے۔ اس انجمن کا یہ اصول ہے کہ مذہبی معاملات میں بالکل غیر جنبہ دار رہے گی۔ انجمن نے جان بوجھ کر اس اصول کو اپنا رہ نما بنایا ہے اس واسطے کہ اس سے بہت سے جھگڑوں بکھیڑوں سے نجات مل جائے گی اور دنیاوی معاملات میں مذہب کو نہیں داخل کیا جائے گا۔ انگلستان کی سب انجمنوں کو اس اصول پر عمل کرنا ضروری ہے۔

گزشتہ جولائی کے مہینے میں لندن میں ہندستان کے متعلق دو تقاریر ہوئیں جن میں پروفیسر گولڈ اسٹکر کی قائم کی ہوئی

---

[1] اہلِ ہند کو یورپ کے سفر میں سہولتیں بہم پہنچانے کے متعلق بابو گردھاری لال نے جو نظام حیدرآباد (دکن) کے ایک عہدہ دار ہیں ایک تجویز پیش کی ہے جو علی گڑھ اخبار مورخہ ۹ جون ۱۸۶۷ء میں تفصیل سے شایع ہوئی ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ ایک خاص طور پر ان سہولتوں کا انتظام کرے جو اہلِ ہند چاہتے ہیں۔ اس جہاز پر کھانے وغیرہ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ اعلا ذات کے ہندوؤں کو بھی اس پر سفر کرنے میں مطلق تامل نہ ہو اور انھیں اپنی ذات کھونے کا اندیشہ نہ رہے۔

مثال پر عمل کیا گیا۔ ایک تقریر ایس ان بنرجی نے کی جس کا موضوع بنگال کے ہندو سماج کی خرابیوں کے متعلق تھا۔ دوسری تقریر سر بارٹل فریر نے کی جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندستانیوں کی رائے عامہ کی کس طرح تنظیم کی جائے۔ بہتر اس کے کہ اس کی نمایندگی باقاعدہ طور پر پارلیمنٹ میں کی جائے جیسا کہ اہلِ ہند کے بہوا خواہوں کی خواہش ہے۔ اس مسئلے کے متعلق بہت بحث ہوئی۔ سیّد محمد محمود نے جو (سر) سیّد احمد خاں کے قابل اور ہونہار فرزند ہیں اور اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، اس مسئلے کے متعلق نہایت بصیرت افروز تقریر کی۔ یہ تقریر انگریزی اور ہندستانی اخباروں میں شایع ہو چکی ہے۔ علی گڑھ اخبار مورخہ ۸ ستمبر ۱۸۷۱ء میں پوری تقریر چھپی ہے۔ سیّد محمد محمود نے دَورانِ تقریر میں کہا کہ ہندستانیوں کی رائے عامہ کو دیسی اخباروں کی رائے سے نہیں جانچنا چاہیے اس واسطے کہ دیسی اخبار حکومت کے خلاف چوں نہیں کر سکتے۔ یہ اخبار حکومت پر تنقیدیں اس لیے نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے آپ کو حکومت کی مطلق العنانی کے سامنے بالکل بے بس تصوّر کرتے ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ حکومت پر تنقید کرنا ایک دشوار کام ہے۔ چوں کہ اہلِ ہند ابھی یورپین تہذیب و تمدّن سے اس قدر بے بہرہ ہیں کہ وہ حکومت کے مسائل اور اس کے کاموں کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود حکومت کے لیے یہ بات ناگزیر اور اہم ہے کہ وہ اہلِ ہند کی رائے عامہ کو معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس بات کا ٹھیک اندازہ

لگاتے کہ عام طور پر اہلِ ہند حکومت کے کاموں کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں۔ دراصل اگر انگریز عہدہ داروں کو اس کا علم ہوتا کہ اہلِ ہند کے خیالات اور احساسات کیا ہیں تو ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کا پہلے سے سدباب کیا جا سکتا اور لوگوں کو بہت سی مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اسی طرح اگر اہلِ ہند کو حکومت کے متعلق صحیح واقفیت ہوتی جو ان کے حل وبست کی مختار ہے تو وہ یقیناً بغاوت نہ کرتے۔ سید محمد محمود کا خیال ہے کہ اس وقت ہندستان کی رائے عامہ رؤس کے ہندستان پر حملے کی متوقع ہے اور اس کی خواہش ہے کہ یہ حملہ ہو اس واسطے کہ یہ ان مظالم کا انتقام ہوگا جو ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد بپا کیے گئے۔ اگر رؤس کا حملہ ہوا تو یقیناً اہلِ ہند حملہ آور کا ساتھ دیں گے تاکہ ایک آقا کی تابع داری چھوڑ کر دوسرے کے آگے اپنا سر جھکائیں۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ ان امور کے متعلق اہلِ ہند کو صحیح واقعات بتائے جائیں اور ان کی توقعات کو غلط ثابت کیا جائے۔ بدقسمتی سے حکومت اس کے شوروشغب سے لاعلم ہے یا دیدہ ودانستہ اس کی کچھ پروا نہیں کرتی۔

ہندستان کی رائے عامہ کے خیال میں حکومتِ ہند کے محکمۂ مال کے انتظامات ناقابلِ اطمینان ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہندستانی لوگوں کو محکمۂ مالیات میں کام کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔

سید محمد محمود کے کہنے کے مطابق ہندستانیوں کی رائے عامہ کو معلوم کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہوگی کہ ضلع واری مجالس قائم

کی جائیں جن میں ان سب لوگوں کو حقِ رائے دہندگی حاصل ہونا چاہیے جو کچھ تھوڑی بہت ملکیت رکھتے ہیں۔ ان مجالس کے ذریعے جن کے ارکان تعلیم یافتہ ہوں گے، حکومت رائے عامہ کا یقین کر سکے گی۔ یہ ضروری نہیں کہ ان لوگوں کی تعلیم انگریزی زبان کے توسط سے ہوتی ہو۔ ہندستانی یا صوبوں کی دوسری زبانوں کے ذریعے سے بھی یہ تعلیم یافتہ بن سکتے ہیں۔

ہندستان کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی جو انجمنیں انگلستان میں قائم ہو رہی ہیں اسی طرح کی انجمنیں ممالکِ متحدہ امریکہ میں بھی قائم کی جا رہی ہیں۔ چناں چہ ایک انجمن 'بوسٹن' میں قائم ہوتی ہے جس میں نہایت عمدہ تقاریر کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس انجمن میں ان ہندستانیوں کی تقریریں بھی ہوتی ہیں جنھوں نے برہمو سماج کے اصلاحی خیالات قبول کر لیے ہیں۔

برسٹل کی "انڈین ایسوسی ایشن" میں ہندستانی عورتوں کی تعلیم کے متعلق خاص طور پر بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ اس انجمن کے ماہ واری رسالے کی اپریل کی اشاعت میں بنگال کے مشہور مصلح کیشب چندر سین کی اس تقریر کے اقتباسات درج کیے گئے ہیں جو انھوں نے کلکتہ میں گزشتہ فروری میں کی تھی۔ مقرر نے دورانِ تقریر میں کہا کہ بنگال میں عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم خود منو شاستر کی رُو سے ناجائز ہے۔ بنگال میں اور ہندستان کے دوسرے مقامات میں یہ رسم مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں میں بھی رائج ہو گئی۔ منو شاستر کے بہ موجب ہندو عورتوں کو اس کی اجازت ہے کہ وہ مدرسوں

ہیں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جائیں اور ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ بابو صاحب نے کہا کہ اس کے بیے تو کوئی اثر مانع نہیں معلوم ہوتا کہ ہندستانی عورتیں پردے میں رہ کر تعلیم حاصل کریں۔ ان کی تعلیم اُن استانیوں کے سپرد ہو سکتی ہو جنھوں نے نسوانی نارمل اسکولوں میں تعلیم پائی ہو۔ اس طرح ممکن ہو گا کہ ہندستانی عورتیں انگریز عورتوں کی طرح اخلاقی اور ادبی ترقی کر سکیں گی اور یورپ کی اعلا اور متوسط سوسائٹی کی عورتوں کے ہم پلہ ہو سکیں گی۔ عورتوں کی ترقی ہی کے باعث آج انگلستان کو یورپین اقوام میں اس قدر بلند مرتبہ حاصل ہو۔ اسی اخبار کی مئی کی اشاعت میں اسی قسم کا ایک مضمون شایع ہوا ہو جو ایک دکنی برہمن کا لکھا ہوا ہو جو آج کل انگلستان میں قانون کی تعلیم پا رہا ہو۔ اُس نے بھی کیشب چندرسین کی طرح عورتوں کی تعلیمی اصلاح اور برہمو سماج کی اصلاحی تحریک کی تائید کی ہو۔ اپنے مضمون میں اس نے بتایا ہو کہ انگریزی تعلیم کے ذریعے سے جو ایک زبردست پانی کے دھارے کے مثل ہو ہندو سماج کی تمام غلاظتیں صاف ہو جائیں گی۔ یہ جذبات قابلِ تعریف ہیں اور خود اہلِ یورپ اس سے بہتر طور پر ان معاملات کو نہیں پیش کر سکتے۔

گلاسگو میں اس انجمن کی ایک شاخ موجود ہو جہاں ہندستان کے مشہور فاضل گوپال چندر رائے نے ان اصلاحات کے متعلق متعدد تقاریر کیں جن کی اشاعت مقصود ہو۔ موصوف نے دعا کے متعلق چند جملے کہے جو یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔ "اگرچہ یہ سچ ہو کہ

مادی عالم میں فطرت کے قابلِ تغیر قانون نافذ ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کی زندگی میں رُوحانی قوانین کی بھی کارفرمائی ہی۔ رُوحانی عالم کا انحصار بالاتر قوت پر ہی جسے خدا کہتے ہیں۔ بغیر توفیقِ الٰہی کے انسان اپنی بہتری کی تدابیر بھی نہیں کرسکتا۔ انسان کو جو کچھ طاقت اور اختیار ملتا ہی وہ خدا سے مانگنے سے ملتا ہی۔ دن کے بعد رات نہایت پابندی سے آتی ہی۔ اس کے لیے ہمیں اس کے طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہی لیکن رُوحانی عالم میں مظاہر کی یکسانیت نہیں ملتی اس لیے کہ وہ مادی قوانین سے بالاتر ہی۔ توفیق انسان کے شاملِ حال اسی حد تک ہوتی ہی جس حد تک اس کی طلب صادق ہوتی ہی۔ یہ چیز انسان کو دعا ہی سے مل سکتی ہی۔ ہم چاروں طرف دُنیاوی خواہشات کے ناپاک اور پُرفریب جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس سے ہم اسی وقت بچ سکتے ہیں جب خدا کی مدد شاملِ حال ہو۔ مکروہاتِ دُنیوی سے محفوظ رہنے کے لیے ہم قوت کہاں سے حاصل کرسکتے ہیں؟ کیا ہم بدی کا مقابلہ خود اپنی قوت سے کرسکتے ہیں؟ یہ صحیح ہی کہ صرف تعلیم ہی کے ذریعے سے ہم اپنے جذبات پر قابو پاسکتے ہیں لیکن کیا اس کا بھی امکان ہی کہ مذہبی اصول اور سائنٹفک علوم کے درمیان مطابقت پیدا کردی جائے؟ ہمیں ضرورت اس کی ہی کہ مذہبی تعلیم کا علاحدہ انتظام کیا جائے جس کے ذریعے ہم خدا کی طرف مائل ہوسکیں اور تمام مخلوقات کے پیدا کرنے والے کے سامنے اپنی نیازمندی کا اظہار کرسکیں۔ بغیر توفیقِ الٰہی کے اس کا امکان نہیں نظر آتا کہ ہم ان آندھیوں

ہیں اپنے توازن کو قائم رکھ سکیں جو ہمارے چاروں طرف چل رہی ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری رُوحانی بہتری کے لیے دُعا ضروری چیز ہی اور اسی کے ذریعے سے ہم دنیوی مکروہات کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اپنے خالق کے آگے اپنی عبودیت اور شکر کا اظہار کر سکتے ہیں۔"

"ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن" کے معتمد دادا بھائی نورو جی گزشتہ جون کے مہینے میں ہندستان واپس گئے ہیں۔ موصوف نے بمبئی، احمد آباد، کاٹھیاواڑ اور کچھ کا دَورہ کیا تاکہ وہاں کے امرا کو اس انجمن کی رکنیت میں شامل کریں۔ موصوف انجمن کے کام کو فروغ دینے کے لیے نہایت گرم جوشی کا ثبوت دے رہے ہیں[۱]۔ اس انجمن کی ہندستان میں متعدد شاخیں ہیں اور بہت سے لوگوں نے اس میں شرکت کی ہی۔ مشہور لوگوں میں جو انجمن کے رُکن بنے ہیں، نواب صاحب جوناگڑھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نواب صاحب نے سالانہ ایک ہزار رُپے چندے کے علاوہ ۱۵ ہزار رُپے کی رقم بطور عطیہ دی ہی۔

بابو کیشب چندر سین کے انگریز احباب اس خیال سے کہ بابو صاحب کلکتہ کے اپنے ایک مندر میں عبادت کے وقت موسیقی کی وہ لَے استعمال کرنا چاہتے ہیں جو کلیسا کی بعض دعاؤں میں استعمال کی جاتی ہی، انھیں ایک ارگن باجا بھیج رہے ہیں۔ برہمو سماج کی بیالیسویں سال گرہ پر جو جنوری ۱۸۷۲ء میں ہونے والی ہی، یہ پہلی مرتبہ بجایا جائے گا۔ برہمو سماج کے جلسوں میں جو دُعائیں پڑھی جاتی ہیں وہ ان دعاؤں سے بہت کچھ ملتی جُلتی ہیں جو انقلابِ فرانس

۱۔ علی گڑھ اخبار۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۸۷۱ء

کے وقت لکھی گئی تھیں جن میں خدا کا تخیل بغیر مذہبی عقائد کے پیش کیا گیا تھا۔ برہمو سماج کی دعائیں مختلف مذہبوں سے ماخوذ ہیں۔ ان میں ہندوؤں، مسلمانوں اور پارسیوں کے مذہبی خیالات کے اجزا شامل ہیں۔

۲۸ جنوری ۱۸۷۱ء برہمو سماج کے پیرووں نے اپنی مذہبی جماعت کے قایم ہونے کی، کلکتہ میں ۴۱ ویں سال گرہ منائی۔ اس روز اس جماعت کے ہزاروں ارکان نے کلکتہ کی سڑکوں پر ہاتھوں میں جھنڈے لیے جلوس نکالے۔ جلوس کے وقت وہ اپنی دعائیں پڑھتے جاتے تھے۔ دوسرے روز وہ سب اپنے مندر میں جمع ہوئے اور ان کے امام نے ان کے روبرو تقریر کی۔ تقریر اور دعاؤں کے بعد، بہ قول اخبار "انڈین مرر" Indian Mirrior جو غالباً برہمو سماج کے مقاصد کا ترجمان ہے، سارے مجمع میں ایک خاص روحانی کیفیت کارفرما تھی اور شرکا کے دل جوشِ مذہبی سے مملو تھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا محبتِ خداوندی سے ان کے دل معمور ہو گئے ہیں اور بہت سے گنہگار اپنے گناہوں کے جنجال سے چھٹکارا پاکر نیک راستہ اختیار کریں گے۔[1]

راجا کالی کرشن بہادر نے برہمو سماج کے ارکان کو دعوت دی تھی کہ وہ درگا پوجا کے موقع پر اس کے ہاں آکر جشن و رقص کی محفل میں شریک ہوں۔ لیکن ان لوگوں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے وہ صرف نظری حیثیت سے ہی نہیں بلکہ عملاً اس قسم کی محفلوں کو خلافِ اخلاق تصور کرتے ہیں اور بت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں، شرکت گوارا نہیں کی[2]

---

[1] انڈین میل۔ ۲۸ فروری ۱۸۷۱ء

[2] انڈین میل۔ ۱۴ نومبر ۱۸۷۱ء

شادی کے موقع پر جو بے جا اسراف ہندوؤں میں کیا جاتا ہی، اس کے خلاف تحریک زور شور سے جاری ہی۔ لالہ پیارے لال نے کایستھوں کی معاشرتی انجمن کی جانب سے ان قواعد کا تعیّن کر دیا ہی جو لاہور سے لے کر کلکتہ تک سب کایستھوں کے لیے واجب التعمیل ہوں گے۔ ان قواعد میں اس کی وضاحت کی گئی ہی کہ دعوتیں وغیرہ کس طرح اور کتنے خرچ کے اندر ہونی چاہییں۔ اسی موضوع کے متعلق مغل سرائے کی "ادبی انجمن" نے ایک رسالہ اُردو میں شایع کیا ہی۔ ۵ رمئی کو انجمن کا جو جلسہ منعقد ہوا اس میں اس اُردو رسالے کا ہندی ترجمہ پڑھا گیا۔ اسی جلسے میں ایک اور اُردو رسالہ پڑھا گیا جو بنارس کی ادبی انجمن کی طرف سے شایع ہوا ہی جس کے مقاصد میں معاشرتی اصلاح بھی شامل ہی[1]۔

ہندستان میں عقدِ بیوگان کی تحریک جاری ہی۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہی کہ ہندو بیواؤں کو نذرِ آتش کرنے کے بجاے زندہ رہنے دیا جائے اور دائمی عبادت و توبہ کی زندگی کے بجاے انھیں دنیاوی زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے۔ برہمو سماج کے ارکان خاص طور پر اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں۔ مغل سرائے کی انجمن بھی اس تحریک میں دل چسپی لے رہی ہی۔ بنارس کے ایک مخیّر شخص سیٹھ ٹھاکرسی دیوجی نے وعدہ کیا ہی کہ برہمن اور بھاٹ لوگوں کی بیواؤں کے عقدِ ثانی کے کُل اخراجات اپنے پاس سے ادا کریں گے۔

"نیشنل انڈین ایسوسی ایشن" کے اخبار کی ستمبر کی اشاعت میں

---

[1] علی گڑھ اخبار۔ ۵ مئی ۱۸۷۱ء

ایک صنعتی اسکول کے قیام کے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ یہ اسکول جبل پور میں حکومت کی طرف سے قائم کیا گیا ہو اور اس کا مقصد یہ ہو کہ ٹھگوں کے بچوں کو دست کاری سکھانے کا انتظام کیا جائے۔ ٹھگ لوگ راہ گیروں کو لوٹتے اور کھسوٹتے اور انھیں قتل کر دیا کرتے تھے۔ انگریزی حکومت نے ان کا استیصال کر دیا۔ ان کے جو بچے باقی رہ گئے ہیں، رحم و کرم کے مستحق ہیں۔ اس مدرسے میں انھیں اپنے ہاتھ سے کسب کرنے کی تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ اپنے باپ دادا کے طریقوں کو چھوڑ دیں اور پُر امن شہریوں کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھیں۔

مذہبی اصلاح کے خیالات سب ہندستانیوں نے ابھی تک قبول نہیں کیے ہیں۔ بعض ہندو امرا کو لندن اور نیویارک میں اپنے مندر قائم کرنے کا خیال دامن گیر ہو۔ چناں چہ بمبئی گزٹ کی روایت کے بہ موجب ہندو امرا کا ایک جلسہ فروری ۱۸۷۰ء میں جوناگڑھ میں ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ چندے کے ذریعے رقم جمع کی جائے تاکہ ان ہندو طلبا کی امداد اور ہمت افزائی ہو سکے جو تعلیمی اغراض کے لیے انگلستان جانا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ لندن میں ایک مندر تعمیر کرایا جائے جو ہری (وشنو) اور مہادیو (شیوا) کے نام پر وقف ہو تاکہ قدیم ہندو دیومالا کے دونوں خداؤں کے عقیدت مند مطمئن ہوں اور انھیں شکایت کا موقع نہ رہے۔ اس مندر کے لیے ایک لاکھ رُپے کی رقم علاحدہ رکھ دی جائے گی۔ اس مندر میں شیوا اور وشنو دونوں کے بُت ہوں گے۔ اس طرح ہندو نوجوان اپنے نئے ماحول میں بھی مذہبی عقائد پر عمل

کر سکیں گے۔"

جیسا کہ عام طور پر یورپ میں خیال کیا جاتا ہی اہلِ ہند کے لیے یہ بات اس قدر آسان نہیں ہی کہ وہ ہندو مصلحین کی تعلیم پر عمل پیرا ہو سکیں۔ ذات باہر ہونے کے خطرے سے لوگوں کو نئے خیالات قبول کرنے میں بہت تامل ہوتا ہی۔ بمبئی کے ایک جج نے جو ذات سے برہمن تھا کیشب چندر سین کے خیالات قبول کر لیے تھے۔ اس سال جو اس کا حشر ہوا وہ ایک بڑی دردناک مثال ہی۔ اس جج کی بیوی مر چکی تھی اور وہ کئی بچوں کا باپ تھا۔ اس نے ایک نوجوان بیوہ سے شادی کر لی۔ اس شادی کے بعد اس کے ذات والوں نے اس کو سخت تکلیفیں دینی شروع کیں اس لیے کہ اس نے ان کے تعصبات کے خلاف آزادیِ رائے سے عمل کیا۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ بے چارہ اپنی زندگی سے تنگ آگیا۔ اس کی پہلی بیوی کے بیٹے نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا تاکہ قانوناً وہ اس کی بیوی اور اُس کا بچہ جو اس دوسری بیوی سے تھا، ذات باہر کر دیے جائیں۔ یہ بے چارہ ان سب باتوں سے مجبور ہو گیا اور اپنی ذات والوں کے ہاتھوں زِچ ہو گیا۔ اس بدقسمت ہندو کے فلسفۂ حیات نے اس کو دھوکا دیا۔ اس نے بالآخر خودکُشی کا عزم بالجزم کر لیا اور اپنی بیوی کو بھی اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ خودکشی کر لے۔ گزشتہ سال ۱۸ فروری دونوں اپنے گھر کے کنوئیں میں کود پڑے۔ دونوں کی نعشیں اس کنوئیں سے

ط Allen's Indian Mail مورخہ ۲۱ مارچ ۱۸۷۱ء

برآمد ہوئیں ان دونوں نے اپنی ذات والوں کے تعقب کی وجہ سے اپنی جان دے دی[1]

بابو سیپد بنرجی نے جو 'براہ نگر' کی معاشرتی انجمن کے معتمد ہیں، اسی قسم کے حالات میں صبر واستقامت سے کام لیا۔ موصوف نے بُت پرستی ترک کر دی ہی اس لیے ذات والوں نے انھیں ذات باہر کر دیا ہی۔ اس کے والدین اور احباب نے تعلقات منقطع کر لیے۔ اس کے گھر کے دروازے اس کے لیے بند کر دیے گئے اور دو دن تک اُسے اور اس کی بیوی کو فاقہ کرنا پڑا۔ ہر قسم کی مصائب برداشت کیں۔ اس کے صبر اور استقلال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ عرصے بعد وہی لوگ جو اسے طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے، اس کے ہم خیال بن گئے[2]۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ ہندو لوگوں میں مذہبی تعقب ابھی تک موجود ہی۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہی کہ ہندو لوگ گاے (اور ایک حد تک بیل) کو مقدس خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ انگریز لوگ اور مسلمان عام طور پر گاے کا گوشت کھاتے ہیں لیکن اس کا ہندستان میں انتظام کیا گیا ہی کہ گاے کو عام شاہ راہوں پر ذبح نہ کیا جائے اور اس کے گوشت کو کُھلا نہ رکھا جائے تاکہ ہندو لوگوں کی اس پر نظر نہ پڑے۔ لیکن معلوم ہوتا ہی پچھلے دنوں پنجاب میں اس قسم کی احتیاط نہیں کی گئی۔ سکھوں کے ایک فرقے کو جسے کوکا کہتے ہیں، یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے کئی قصائیوں کو قتل

---

[1] ڈیلی ٹیلی گراف ۲۹ مارچ ۱۸۷۱ء

[2] جرنل آف دی انڈین ایسوسی ایشن۔ مارچ ۱۸۷۱ء

کر ڈالا۔ حکومت کی مداخلت سے فساد رفع کیا گیا اور کئی ملزم گرفتار کیے گئے۔ 'کوکا'، لوگوں کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ہے۔ ان کے گرو کا نام رام سنگھ ہے جس کی وہ بلا چون وچرا اطاعت کرتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ امرتسر میں گائے ذبح کرنا موقوف کر دیا جائے۔ تاکہ پھر ان سے جھگڑا نہ ہو۔ حکومت کو اس کے متعلق کچھ انتظام کرنا ہوگا۔[۱]

ہندوؤں کی ترقی پسند جماعت برہمو سماج جس کے لیڈر کیشب چندر سین ہیں، حکومت سے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ اس کے اراکین کو اپنے اصلاحی خیالات کے مطابق شادی کی اجازت دی جائے۔ یہ لوگ سول شادی کے قائل ہیں جو ان تمام ملکوں میں رائج ہے جہاں عقائد کی آزادی موجود ہے۔ چناں چہ اس باب میں ایک مسودۂ قانون تیار کیا گیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ان مصلحین کی قدیم شاخ جس کے سربراہ بابو ربندرا ناتھ ٹگور ہیں، سول شادی کی مخالف ہے۔ وہ ہندوؤں کی قدیم طرز کی مذہبی شادی کی تائید میں ہے اگرچہ ہندوؤں کے دوسرے عقائد میں یہ جماعت بھی یقین نہیں رکھتی۔ اس مسئلے پر برہمو سماج کی دونوں شاخوں میں اختلاف رائے اور نا اتفاقی پیدا ہو گئی ہے۔

ہندستان کے لیے یہ ایک زبردست انقلاب ہوگا اگر یہ ملک انگریزی اثر سے مسیحیت کو قبول کرے۔ انگلستان ایک مسیحی ملک ہے اور اس کا دعوا بھی ہے کہ وہ مسیحیت کی نشر و اشاعت میں کوشاں ہے۔ لیکن اگر ہندستان مسیحیت قبول کرے گا تو اس کے

---

[۱] Allen's Indian Mail مورخہ ۱۲ و ۲۴ ستمبر ۱۸۷۱ء

لیے وقت درکار ہو۔ اگر واقعی مسیحیت حقیقی معنوں میں اہلِ ہند کی زندگی میں تبدیلی کرے گی تو یہ بہ تدریج ہی ممکن ہو گا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسیحی مبلغین سعی و جہد میں منہمک ہیں۔ وہ اپنا مستحسن کام کیے جا رہے ہیں اگرچہ گلیڈسٹن کی وزارت نے نہ صرف اُن کی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ کھلم کھلا ان سے مخالفت کا اظہار کیا ہو۔[1]

لُدھیانہ کے امریکی مسیحی مشن کی طرف سے متعدد ہندی کے رسالے شایع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر ریورنڈ ای ڈبلو ویری، ریورنڈ ایس۔ایچ۔ کلوگ اور ڈاکٹر ولسن کے لکھے ہوئے ہیں۔ اسی مشن نے سات ہندستانی زبانوں میں کتابیں شایع کی ہیں۔

جنوبی بنگال کے "امریکن فری بپٹسٹ مشن" کی رپوٹ جو مارچ ۱۸۷۱ء میں شایع ہوئی ہے، ہر طرح قابلِ اطمینان معلوم ہوتی ہو۔ دیسی عیسائیوں نے جن میں سے اکثر سنتالوں پر مشتمل ہیں، ایک کلیسا عبادت کے لیے اپنے آپ تعمیر کیا ہو۔ اس مشن کے مدارس میں سات سو سے زائد طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔[2]

کلیسا ے ویز کی خواہش ہو کہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے کام میں ہندستان میں کچھ حصہ لے۔ برٹش کے اسقف، ریورنڈ ڈاکٹر فوربس اور اس کے بھائی ریورنڈ جی ایچ فوربس اس کلیسا کے زمرے میں شامل ہیں۔ یہ دونوں بھائی اپنی قابل قدر تصانیف کی بدولت ادبی اور مذہبی حلقوں میں بہت عرصے سے شہرت

---

[1] فرینڈ آف انڈیا، ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۱ء [illegible]

[2] Allen's Indian Mail مورخہ ۲۹ اگست ۱۸۷۱ء

رکھتے ہیں۔ اس کلیسا نے اپنا ایک مشن ہندستان میں 'چندا' کے مقام پر قائم کیا ہے اور عنقریب دوسرے مقامات پر بھی اس کی شاخیں قائم ہو جائیں گی۔ کلکتہ کے اسقف ریورنڈ آرملین نے بجائے مخالفت کے کلیسائے ویلز کے مشن کی ہر طرح ہمت افزائی کی ہے۔

"کرسچین ورناکلر ایجوکیشن سوسائٹی" ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کے بعد قائم کی گئی تھی۔ اس کی تیسری رپوٹ میرے پیشِ نظر ہے۔ اس انجمن نے ۲۰ ہزار پونڈ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے کتابیں چھپوانے پر صرف کیے ہیں۔ یہ کتابیں ہندستان کی مختلف زبانوں میں، جو ۱۸ کروڑ اہلِ ہند بولتے ہیں، طبع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کے نسخوں کی تعداد تیس لاکھ ہے۔ یہ کتابیں کولمبو تک بھیجی جاتی ہیں۔ اس انجمن کے اس وقت ۱۱۷ مدارس چل رہے ہیں جن میں ۴۲۲۰ طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ ان مدارس میں عیسائی مدرس دُنیاوی اور مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔

"انجمن اشاعتِ انجیل" کی بمبئی کی شاخ کا سالانہ جلسہ ۲۱ دسمبر ۱۸۷۰ء بہ مقام ٹاؤن ہال منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت ریورنڈ ایچ۔ اے ڈگلس نے کی جو بمبئی کے اسقف ہیں۔ اس جلسے میں مسٹر پنڈٹ نے جو انجمن کے معتمد ہیں، اپنی رپوٹ پڑھ کر سنائی۔ اس رپوٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ احاطۂ بمبئی میں مسیحیت کی تبلیغ قابلِ اطمینان رہی ہے اور اس علاقے میں آیندہ انیگلی کن کلیسا کی ترقی کے اور زیادہ امکانات ہیں۔

جرمن مبلغین بھی مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے کام میں

منہمک ہیں۔ ان کا سرگروہ برلن کا مبلغ 'گوسنر' ہے۔ اس نے 'کول' لوگوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی ہے۔ 'کول' لوگ چھوٹا ناگ پور کے علاقوں میں آباد ہیں۔ اس وقت اس علاقے میں تقریباً ۱۴ ہزار عیسائی اس شخص کی مساعی کی بدولت موجود ہیں۔ چوں کہ جرمن مبلّغین کا تعلق حاکم قوم سے نہیں ہے اس واسطے غالباً دیسی لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے مشرق کے ایک حصے میں رُوس خدا کی طرف سے بھیجا گیا۔ تاتار اور چین میں رُوسی مبلّغین جو نہایت پُر جوش ہیں، مسیحیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ بعض رُوسی مبلّغین ہندستان کی سرحد تک پہنچ گئے ہیں۔

رومن کیتھولک مشن ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی کام یابی کا حال جو انھیں ہندستان میں حاصل ہو رہی ہے "حالات تبلیغِ مذہب" سے معلوم ہوا۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں اس مشن کے مبلّغین نے کراچی میں ایک پارسی کو مسیحی زمرے میں شامل کیا یہ نوجوان غالباً پہلا شخص ہے جو پارسیوں کی ملت میں سے مسیحی حلقے میں داخل ہوا۔[1]

مسٹر جان مردوش نے اپنے رسالے "ہندستان میں مسیحی ادب پر تبصرہ" میں تفصیل سے ان مذہبی کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے جو مبلّغینِ مسیحیت نے سنہ ۱۸۷۰ء میں ہندستان میں شایع کی ہیں۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں صرف مظفرپور کے جرمن مشن نے ۱۴۷۶۰ء نسخے ہندی رسائل کے اور ۳۵۰۴ نسخے اُردو کے شایع کیے۔ مرزاپور میں

---

[1] انڈین میل۔ ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ء

بھی اشاعت کی رفتار خاصی تیز رہی۔ الہ آباد میں ریورنڈ جے والش اُردو زبان میں "خزینۂ مسیحیت" بہ دستور شایع کر رہے ہیں۔ اس ماہ وار رسالے کی زبان اُردو ہوتی ہی لیکن اس کا رسمِ خط رومن ہوتا ہی تاکہ دیسی عیسائی لوگ اسے بہ سہولت پڑھ سکیں۔

"میتھوڈسٹ امریکن مشن" نے مسیحی ہندستانی ادب کی متعدد کُتب شایع کی ہیں۔ اس سال سات نئی کتابیں ہندستانی زبان کی شایع ہوئیں اور چار ہندستانی کتابوں کو دوبارہ چھاپنے کی نوبت آئی۔ جب سے یہ مشن ہندستان میں قائم ہوا ہی، جسے بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا، اس نے اُردو اور ہندی میں ۶۰ مطبوعات شایع کی ہیں۔ اس مشن کے دو اُردو کے رسالے نکلتے ہیں جن میں سے ایک ماہ وار ہی اور دوسرا مہینے میں دو مرتبہ نکلتا ہی۔

علومِ مسیحی کی ترقی کے لیے جو انجمن ہندستان میں کام کر رہی ہی اس کی شاخیں تین پریسی ڈنسیوں میں موجود ہیں۔ اس انجمن نے جو خاص کتاب شایع کی ہی وہ Common Prayer Book کا اُردو اور ہندی ترجمہ ہی۔ اس کے علاوہ انجمن نے صرف مدراس میں ہندستانی زبان کی کتابیں اور رسالے پان سو کی تعداد میں شایع کیے ہیں۔ ہندستان میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا مفید کام اور دوسری انجمنیں بھی انجام دے رہی ہیں۔ لاہور کے "ڈوینٹی اسکول" کے متعلق میں گزشتہ سال اپنے مقالے میں ذکر کرچکا ہوں۔ اس اسکول کے بانی ریورنڈ جے ڈبلو صاحب تھے جن کا ابھی حال میں انتقال ہوگیا۔ ان کے ساتھ اس کام میں

ریورنڈ جے ڈبلو فرینچ اور ریورنڈ آر کلارک بھی شریک تھے۔ ان کے پیشِ نظر یہ مقصد تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے غلط عقائد کی انجیلِ مقدس کی تعلیم سے تکذیب کریں۔ اس مدرسے کے فارغ التحصیل انجیلِ مقدس اور اس کی تفاسیر کے مطالعے مسیحیت کے خلاف جو تحریریں ہیں ان کے رد اور ان قدیم زبانوں کی تحقیق سے جن میں تحریریں لکھی گئی ہیں، مسیحی حقائق کو اُجاگر کر سکیں گے۔ اس ادارے کو جدید اصول پر چلایا جائے گا۔ یہاں کے طلبا غریب ہندستانی طلبا کی طرح سے زندگی بسر کریں گے۔ کسی قسم کی مغربی نمود و نمایش نام کو نہ ہوگی۔ ان طلبا کا فرض ہوگا کہ دیسی لوگوں کی زبانیں سیکھیں اور ان کے رسوم و عادات اختیار کریں تاکہ ان میں کام کر سکیں۔ وہ سب کے سب سینٹ پال کے نمونے کو اپنے سامنے رکھیں گے تاکہ دوسروں کو مسیحی زمرے میں شامل کر کے ان کی ارواح کو نجات کا راستہ بتائیں۔ وہ سینٹ پیٹر کی طرح حکیم ہوں گے جب کہ اس نے "کورنیَ" کو اس کی اجازت تک نہ دی کہ اس کے سامنے جُھکے۔ جو لوگ ان کے دین میں شامل ہو جائیں گے چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہوں وہ ان کے بھائی بن جائیں گے۔

فیروز پور کے بابو مایا داس کے عیسائی ہونے سے لوگوں میں سنسنی پیدا ہو گئی ہے۔ بابو صاحب کا اس شہر کے ذی وجاہت لوگوں میں شمار ہوتا ہے جن کی ہر چھوٹا بڑا عزت کرتا تھا اس ضمن میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ کسی مسیحی مبلغ کے توسط سے بابو صاحب نے مسیحی مذہب نہیں قبول کیا بلکہ خود اپنے ذاتی مطالعے اور غور و فکر

سے انھوں نے اس مذہب کی حقانیت کو پہچانا۔ اگرچہ بابو صاحب کے بعض ہم وطنوں نے انھیں عیسائی ہونے سے روکنے کی کوشش کی لیکن موصوف نے انھیں اپنے مذہب بدلنے کی وجوہ اچھی طرح سمجھا دیں۔

لکھنؤ کی قدیم برہمو سماج جماعت کے تین ممتاز ارکان نے مسیحیت کی تعلیم قبول کر لی ہے۔ ان میں بابو چندر سین قابلِ ذکر ہیں جن کے نام کو بابو کیشب چندر سین مصلح برہمو سماج کے نام کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ بابو چندر سین نے 'وزلی' کے پروٹسٹنٹ مسلک کو اختیار کیا ہے۔

مخلص عیسائیوں کو یہ سُن کر خوشی ہونی چاہیے کہ ایشیا اور افریقہ میں عیسائی مذہب کو خوب فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ انھیں یہ بات دیکھ کر دُکھ ہونا چاہیے کہ مسیحی تعلیم کا اثر خود یورپ میں دن بہ دن کم ہوتا جاتا ہے۔ یورپ میں جسے "علمِ مذہب" کہا جاتا ہے وہ "علمِ لامذہبی" کے مترادف ہے۔ یہ "علمِ مذہب" Science of Religion ایمان کا دُشمن ہے اور گزشتہ صدی کے نظری اصول اور مضحکہ خیز بے اعتقادی کے ساتھ موجودہ صدی کی تشکیک سے اس کی ساخت ہوئی ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کیتھولک مذہب کی ترقی ہو رہی ہے اور اس پر جو حملے ہوتے ہیں وہ ان سے اپنا بچاؤ کر لیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں اندر ہی اندر گھُن لگنا شروع ہو گیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہندستانی لوگوں کو ان تمام زبانوں کا علم نہیں پس ہمیں خواہش کرنے دو کہ وہ مسیحیت کے سچے مذہب کو قبول کریں گے اور اس راستے میں داخل ہوں گے جو دُنیاوی طوفانوں

سے بچنے اور نجات کی طرف ... جانے والا ہے۔

جس طرح زندگی کا انجام موت ہے اسی طرح میں اپنے تبصرے کو ان بزرگوں کی موت کے ذکر پر ختم کرتا ہوں جو گزشتہ سال اس دنیا سے گزر گئے۔

سب سے پہلے میں الگزنڈر کاظم بے کے انتقالِ پُر ملال کا ذکر کروں گا۔ وہ رُوس کے نہایت ممتاز باشندوں میں تھے اور علمی دنیا میں ان کی شہرت تھی۔ اگرچہ انھیں ہندستانی زبان سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ایک علم دوست مستشرق کی حیثیت سے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے تاتاری زبانوں پر اپنی تحقیقات شائع کیں جن کے متعلق فرانس میں موسیو پاوے دے کورتیؔ کام کر رہے ہیں جو مشہور مستشرق سلوسترد ے ساسیؔ کے پوتے ہیں۔ الگزنڈر کاظم بے اسلامی ہند کی کلاسکی السنہ یعنی عربی اور فارسی اچھی طرح جانتے تھے جیسا کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ میں ذیل میں مرحوم کی زندگی کے حالات لکھتا ہوں جو ان کے فرزند سے مجھے حاصل ہوتے ہیں۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کی زندگی کس قدر مشغول رہی۔ سرکاری ملازمت، مختلف اکاڈمیوں کی رُکنیت، شاہی نوازشیں اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مرزا کاظم بے 'دربند' کے ایک اعلا خاندان کے رُکن تھے۔ وہ ایک فاضل اور پارسا شخص تھے۔ گزشتہ صدی کے آخری ایام میں قاف کے علاقوں میں جو شورشیں ہوئیں، ان کے باعث وہ ترکِ وطن

کر کے مکّے چلے گئے اور پھر وہاں سے مدینے پہنچے۔ بالآخر ایران میں 'رشت' کے مقام پر سکونت پزیر ہوئے جہاں انھوں نے ایک خاتون سے شادی کر لی۔ ۱۸۰۲ء میں ان کے ہاں ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام محمد علی بیگ رکھا۔ ۱۸۰۵ء میں وہ تنہا 'قاف' آئے اور بیوی بچّے کو ایران ہی میں رہنے دیا۔ جب وہ شیخ الاسلام مقرر ہو گئے اور 'دربند' میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی تو اپنی بیوی اور بیٹے کو بھی ایران سے 'قاف' بُلا لیا۔ کچھ عرصے بعد ان کے دُشمنوں نے حکومتِ رُوس کو ان سے بدظن کر دیا۔ ان پر انقلابی رُجحانات کا الزام قائم کیا گیا اور مقدمہ چلایا گیا۔ ان کا سارا مال اسباب اور ملک بحقِ سرکار ضبط کر لی گئی اور انھیں 'استراخان' جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ واقعات ۱۸۲۰ء میں گزرے۔ اگلے سال ان کا بیٹا بھی انُ کے پاس 'استراخان' آ گیا۔ اس کی عمر اس وقت ۱۸ سال تھی۔ اس کی ابتدائی تعلیم مکان ہی پر ہوئی تھی اور اس نے قرآن حفظ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ فقہ اور عربی، فارسی اور تُرکی ادب کی واقفیت بھی بہم پہنچائی تھی۔ اتفاق سے 'استراخان' میں اس کی ملاقات اسکاٹ لینڈ کے مبلغینِ مسیحیت سے ہوئی جنھوں نے اس کو ترکی اور عربی پڑھانے کی ترغیب دی۔ وہ انھیں عربی ترکی سکھانے پر آمادہ ہو گیا بشرطیکہ وہ اس کو انگریزی پڑھائیں۔ اس طرح اس کا تعلق مبلّغینِ مسیحیت سے قائم ہو گیا۔ چوں کہ وہ ایک جوشیلا نوجوان مسلمان تھا اس لیے حتّی المقدور وہ ان مشنریوں سے مذہبی بحث مباحثہ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ مسیحیت کے مقابلے میں مذہب اسلام

کی فوقیت ثابت کرے۔ چناں چہ اس خواہش کے تحت اس نے انجیل کا مطالعہ شروع کیا۔ انجیل کی تعلیم سے واقف ہونے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے اسلامی عقائد کمزور ہونا شروع ہو گئے اور حقیقت کی چبھن اس کے دل میں رہنے لگی۔ بالآخر وہ مسیحیت کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ اس کے باپ نے ہر چند کوشش کی کہ وہ مذہب اسلام کو ترک نہ کرے لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ چناں چہ اس کے باپ نے اس سے ترکِ تعلق کر لیا اور مرتے وقت اس کو معاف کیا۔ اس کے عزیز و اقارب نے بھی اس کو طرح طرح سے ستایا اور دھمکیاں دیں لیکن وہ مسیحیت کے جدید عقائد پر قائم رہا۔ اسکاٹ لینڈ کے مشنری نے اسے بپتسما دیا اور اس کا نام مرزا الکزنڈر کاظم بیگ تجویز کیا۔ بپتسمے کی رسم ایک بڑے جلسے میں ۲۹ر جون ۱۸۲۳ء کو منائی گئی۔ الکزنڈر کاظم بیگ کا خیال پہلے مبلّغِ مذہب بننے کا تھا لیکن اس کو یہ خیال بہت جلد ترک کرنا پڑا اس واسطے کہ روسی حکومت نے اس کے پاس احکام روانہ کیے کہ ایک امیر زادہ اور روسی رعایا کی حیثیت سے اس کو کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس پر اس نے حکومت سے درخواست کی کہ اسے وزارتِ امورِ خارجہ میں کچھ کام دیا جائے تو مناسب ہو اس لیے کہ وہ ترجمانی کے فرائض بہ خوبی انجام دے سکتا ہے۔ لیکن 'امسک' (سائبیریا) کے مدرسہ شرقیہ میں استاد کی حیثیت سے اس کا تقرر کیا گیا۔ جب وہ 'امسک' جا رہا تھا تو راستے میں 'کازان' میں سخت بیمار ہو گیا۔ جب وہ اچھا ہوا تو 'کازان' میں اس کے بعض قدردانوں نے اس سے وہیں کی جامعہ میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چناں چہ وہ 'کازان'

کی جامعہ میں مشرقی زبانوں کا اُستاد مقرر ہو گیا اور کچھ عرصے بعد ادبی شعبے کا صدر ہو گیا۔ ۱۸۵۰ء میں سینٹ پیٹرس برگ بلا لیا گیا اور امپیریل اکاڈمی کا اسے رُکن بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ جامعہ کے شعبۂ ادبی کا صدر اور مشیرِ خصوصی کے عُہدے سے سرفراز کیا گیا۔

ہم (گارساں دتاسی) تقریباً بیس سال سے خط و کتابت کے واسطے سے الکزنڈر کاظم بیگ سے واقف تھا۔ ۱۸۶۹ء میں جب وہ پیرس آئے تو مجھے ذاتی طور پر ان سے ملاقات کرنے کا موقع حاصل ہوا۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ چناں چہ لندن اور پیرس میں جو لوگ ان سے ملے وہ ان کے بڑے مدّاح ہو گئے۔ ان کا علم و فضل اور فطری ذوق قابلِ تعریف تھا۔ اس زمانے میں جب ان سے ملا تھا تو ان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ چناں چہ ناسازیِ مزاج کا سلسلہ جاری رہا اور ۲۷ نومبر ۱۸۷۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

مرزا محمد وجاہت علی کو جو "اخبارِ عالم" اور "سماچار درپن" کے مُدیر ہیں، ۱۸۷۰ء کے آخری ایام میں سخت صدمے پہنچے۔ ان کا ایک بچہ جس کی عمر تین سال تھی اور دوسرا بچہ جو صرف چند ماہ کا تھا، ضائع ہو گئے۔ موت نے دونوں بچوں کو چند ہفتوں کے فصل سے ان کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ مرزا صاحب کے احباب اور ان کے اخباروں کے پڑھنے والے ان کے ساتھ رنج میں شریک ہیں۔ ان بچوں کی موت کی تاریخ بھی نکالی گئی ہے جو ظاہر ہے غم زدہ والدین کی تسلّی کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن والدین کو یقین ہے

کہ قیامت کے دن وہ اپنے بچّوں کو دیکھیں گے۔ قیامت کا یہ انجیلی عقیدہ قرآنی تعلیمات میں بھی موجود ہے۔

پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر ہنری ڈیورنڈ نے یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو ہاتھی پر سے گر کے انتقال کیا۔ وہ 'اڈسکومب' کے اسکول کے ہونہار طالب علم تھے۔ اس اسکول میں انھوں نے اپنے استاد جان شیکسپیر سے ہندستانی زبان سیکھی تھی جو میرے بھی استاد تھے۔ سر ہنری ڈیورنڈ ۱۸۲۸ء میں فارغ التحصیل ہو کر ہندستان گئے۔ غزنی کی فتح میں وہ شریک تھے۔ پھر لارڈ الن برد کے معتمد ہو گئے جن کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے۔ اس کے بعد سول سروس کے مختلف اہم عُہدوں پر مامور رہے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع پر وہ اندور میں ریزیڈنٹ تھے۔ اس کے بعد انگلستان میں انڈیا کونسل کے رُکن مقرر ہوئے۔ پھر وہاں سے ہندستان واپس آئے اور لارڈ کیننگ کی حکومت میں معتمد اور خارجی کے عُہدے پر سرفراز ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں وائس رائے کی کونسل کے رُکن مقرر ہوئے اور سب سے آخر میں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر بنائے گئے۔ آج انگلستان اور ہندستان میں سر ہنری ڈیورنڈ کی ہر طرف تعریف ہو رہی ہے۔ ان کی خدمات، ان کی فوجی قابلیت اور نظم و نسق کی صلاحیت کو ہر کوئی تسلیم کر رہا ہے۔ ان کے تدبر، خوش فہمی اور وسیع اخلاق کے متعلق ہر طرف لوگ ذکر کر رہے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو موت کو زندگی کا دروازہ تصوّر کرتے ہیں۔ درحقیقت "موت ایسی چیز ہے جس پر جری لوگ قابو پا لیتے ہیں، عقل مند لوگ اس کے منتظر

رہتے ہیں، غم زدہ لوگ اس کی خواہش کرتے ہیں اور نیک لوگ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اس واسطے کہ وہ جانتے ہیں کہ ابدی روشنی کا راستہ قبر ہی کی تاریک گلی سے ہو کر جاتا ہے"۔

میں نے اپنے ۱۸۷۰ء کے تبصرے میں ان مختلف قصّوں کی نسبت ذکر کیا تھا جن کی اشاعت مدراس کے میجر مارک ولیم کار نے اپنے ذمے لی تھی، یہ قصّے دکنی زبان کے ہیں۔ آج مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اس فاضل مستشرق کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے سبب سے وہ کام رُک جائے گا جسے اس نے شروع کیا تھا۔ میجر کار کو متعدد مشرقی زبانوں پر جو قدرت حاصل تھی اس کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ تلنگی زبان کی ضرب الامثال پر جو کتاب اس نے شایع کی تھی وہ بہت مشہور ہوئی اور اس سے اس کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے۔ میجر کار کو خاص طور پر ہندستانی زبان سے لگاؤ تھا۔ اس کے انتقال سے اس محدود طبقے میں بڑی کمی پیدا ہو گئی جو ہندستانی زبان کے قدر دانوں کا ہے۔ اس کا ایک خط مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۸۷۰ء بمبئی سے میرے نام آیا تھا۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا کہ وہ دو ایک ماہ کے لیے بمبئی سیر و تفریح کے لیے آیا ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ مدراس چلا جائے گا۔ غالباً سمندری راستے سے وہ "جنرل آوٹرم" نامی جہاز سے واپس ہوا اور راستے میں ڈوب کر مر گیا۔ میرے اور میجر کار کے تعلقات بہت گہرے اور قدیم تھے۔ نہ صرف ادبی مشاغل کی یکسانیت کے باعث بلکہ مذہبی عقائد مشترک ہونے کی وجہ سے میرے وہ بڑے مخلص

دوستوں میں سے تھے۔ وہ اپنی مذہبیت کی وجہ سے مدراس کی سوسائٹی میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

یکم اپریل ۱۸۷۱ء مسز مینگ کا انتقال ہو گیا جو "ہند قدیم و وسطیٰ" کی مصنفہ تھیں۔ یہ اس زمانے کی نہایت فاضل اور خوش اخلاق انگریز عورت تھیں۔ یہ خاتون ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئیں مس کارپنٹر کی طرح انھیں بھی راجا رام موہن رائے کی دوستی کی وجہ سے ہندستان کے ساتھ شغف پیدا ہو گیا۔ راجا رام موہن رائے اپنے قیامِ انگلستان کے دوران میں مسز مینگ کے والد کے ہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ مسز مینگ نے اپنے پہلے شوہر ڈاکٹر اسپیئر کی معیت میں ہندستان میں تین سال گزارے اور خود اپنی آنکھوں سے وہ تمام حالات دیکھے جو بعد میں ان کی تحریروں کا موضوع بنے۔ وہ ہندستانی زبان بلا تکلف بول سکتی تھیں اور اہلِ ہند سے گفتگو کر سکتی تھیں۔ انگلستان میں واپسی پر انھوں نے اپنی کتاب "قدیم ہند کی زندگی" تصنیف کی۔ یہ ان کی پہلی تصنیف تھی جو دو جلدوں میں ۱۸۶۹ء میں شایع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انھوں نے مسٹر مینگ سے شادی کر لی جو مشہور قانون داں شخص تھے۔ مسز مینگ نے 'ہچن' کے مدرسۂ نسواں کے قیام میں اپنی فیاضی اور مشورے سے بڑی مدد دی۔ گزشتہ سال جب بابو کیشب چندر سین انگلستان آئے تو مسز مینگ نے انھیں دعوت دی بالکل اسی طرح جیسے ان کے والد راجا رام موہن لال کو اپنے ہاں مدعو کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ مسز مینگ نے "انڈین ایسوسی ایشن"

کے قائم کرنے میں بڑی امداد کی تھی اور مس کارپنٹر کے ساتھ تعاونِ عمل کیا تھا۔ ان کی بہو مس ای اے میننگ بھی ہندستان کے ساتھ ہم دردی رکھتی ہیں۔ وہ صرف "انڈین ایسوسی ایشن" ہی میں شریک نہیں ہیں بلکہ انھوں نے لندن میں اس قسم کی ایک اور انجمن قائم کی ہے جس کی وہ اعزازی معتمد ہیں۔

گزشتہ ستمبر میں کلکتہ میں ایک مشہور مجسٹریٹ جے سی نارمن کو کسی نے قتل کر ڈالا۔ وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ وہ اگرچہ اپنے فیصلوں میں سخت تھے لیکن انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ لوگ ان کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے اور ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ کسی متعصب وہابی نے انھیں قتل کیا ہے لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان کے قتل میں کوئی سازش نہیں تھی۔ ایک پٹھان نے جس کا نام عبداللہ تھا، بھنگ کے نشے میں انھیں قتل کر ڈالا۔ اس کو جج سے یہ شکایت تھی کہ اس نے اس کی عرض داشت کو لینے سے انکار کیا۔ قاتل کو پھانسی دی گئی اور اس کی نعش کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ جب اس پٹھان کو پھانسی کے لیے لے جانے لگے تو وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ چلتے وقت اس نے صرف ہندستانی کا لفظ "اچھا" کہا اور بس۔

مسٹر 'نارمن' کے قتل پر کلکتہ کے پورے شہر نے ماتم کیا۔ ان کی موت ایک عام نقصان خیال کی گئی۔ شہر کی دکانیں بند کر دی گئیں۔ شہر کے عیسائی، ہندو اور مسلمان ان کے جنازے کے ساتھ

قبرستان تک گئے۔ مسلمانوں نے خاص طور پر ان کے قتل پر اظہارِ رنج کیا اس واسطے کہ متوفی جج کو ان کی بہتری کا خیال رہتا تھا۔ مسلمانوں نے ایک عام جلسہ منعقد کیا جس میں قتل پر اظہارِ ملال کیا اور متوفی جج کی یادگار قائم کرنے کے لیے چندہ کیا۔ سیّد عبداللہ نے Allen's Indian Mail کی ۱۹ر دسمبر ۱۸۷۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون شایع کیا ہے اور اس میں یہ امر ثابت کیا ہے کہ اس قتل میں کسی قسم کی سازش نہیں تھی بلکہ وہ صرف ایک شخص کا ذاتی فعل تھا۔

آخر میں مَیں اپنے ناظرین کو بتادوں کہ جج نے مرتے وقت اتوار کے دن والی مناجات پڑھنے کو کہا اور خود یہ الفاظ دُہرائے: "ہمارے قصور معاف فرما جس طرح ہم معاف کر دیتے ہیں"۔ بہ قولِ سینٹ جان "انھیں ابدی مسرت حاصل ہو گی جو خدا کے لیے مرتے ہیں"۔ ورڈزورتھ نے کیا خوب کہا ہے:

"اس جنتِ نعیم کی خوبیاں اور شان کون بیان کر سکتا ہے۔ جب خود خدا اس کے متعلق بہت کم کہتا ہے تو دانش مندی کا اقتضا یہ ہے کہ خموشی اختیار کی جائے"۔

۱۸۷۲ء

مترجمہ

(از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد)

ہندستانی زبان اور ادب پر جو میری سالانہ تقریظیں شایع ہوتی ہیں، وہ نہ صرف یورپ میں بلکہ ہندستان میں بھی قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ چناں چہ دیسی اخبارات میں ان کے بعض حصّوں کے ترجمے بھی شایع کیے جاتے ہیں۔ میرے ۱۸۷۱ء والے مقالے کے ایک حصّے کا ترجمہ مظفر پور کے "اخبار الاخیار" مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۸۷۱ء اور "اخبار انجمنِ پنجاب" مورخہ ۹ر اگست ۱۸۷۱ء میں شایع ہوا ہی۔ یہ ترجمہ مسٹر ڈرمنڈ کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہی۔ ان دونوں مذکورہ اخبارات میں میری تصویر بھی شایع کی گئی ہی۔ جو لوگ مجھ سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ میری اس تصویر کو دیکھ کر جو "اخبار انجمن پنجاب" میں نکلی ہی، پہچان لیں گے لیکن "اخبار الاخیار" میں میری جو تصویر چھپی ہی وہ عجیب سی معلوم ہوتی ہی۔

اب ۱۸۷۲ء کا سالانہ مقالہ تیار کرتے وقت میری ہمت بلند ہی اور میں ایرانی شاعر کا یہ شعر پڑھتا ہوں:۔

آغاز کردۂ بہ رسانش بہ انتہا
طرحے فگندۂ بہ عنایت تمام کن

یورپ کی طرح ہندستان میں بھی زمانہ اپنی کروٹیں بدل رہا ہے۔ ہندستان کے برِاعظم میں بتدریج تغیرات ظہور پزیر ہو رہے ہیں۔ ہندو اور مسلمان یہ ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ ایک قوم بن جائیں اور جہاں تک ممکن ہو مغربی تمدن کو اپنی زندگی میں سمو لیں۔ بالکل اسی طرح جیسے مسیحیت کے آغاز کے وقت یہودی اور رومن لوگ گھل مل کر ایک ہو گئے تھے حالاں کہ ان دونوں کے درمیان اختلاف کی ایک زبردست دیوار حائل تھی۔ لیکن باوجود اس خواہش کے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، اُردو اور ہندی کے متعلق لسانی بحث مباحثے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ہندستان کے ایک اخبار میں پڑھنے میں آیا کہ صوبہ شمال مغربی کے دو لاکھ رجعت پسند ہندوؤں کے دستخط سے کلکتہ کی انگریزی حکومت کے رُوبرُو ایک معروضہ پیش کیا گیا ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ تمام سرکاری کارروائیاں بجائے عربی رسمِ خط کے جس میں اُردو لکھی جاتی ہے، دیوناگری رسمِ خط میں ہونی چاہییں جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس بیان میں کچھ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ غالباً مذکورہ بالا معروضے سے وہ یادداشت مُراد ہے جو بابو شیو پرشاد نے حکومت کو بھیجی تھی اور جس پر ۵ ہزار اشخاص کے دستخط تھے جن میں مدرسے کے طلبا، بابو شیو پرشاد کے ماتحت اور ان کے احباب شامل تھے۔ بابو شیو پرشاد مہتمم تعلیمات ہیں اور ہندی زبان کے زبردست حمایتی ہیں۔ ان کی یادداشت کے متعلق مجھے ایک بہاری مسلمان کے مضمون کے ذریعے اطلاع ملی جو "اخبارِ انجمن پنجاب" مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۲ء

میں شایع ہوا ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ سرکار انگریزی اس وقت کے معروضوں کو کبھی تسلیم نہیں کرے گی اس واسطے کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کیا جائے جو اپنے رسمِ خط کو بہت عزیز رکھتے ہیں اس واسطے کہ قرآن کریم کا رسمِ خط یہی ہے۔ لیکن کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ ہماری مضمون نگار اس ضمن میں یوں رقم طراز ہے:۔

"اس خبرِ وحشت اثر نے سارے ہندستان میں کھلبلی ڈال دی ہے۔ بابو شیو پرشاد نے جو پتھر پھینکا ہے وہ مسلمانوں کے سر پر بہت زور سے لگا ہے۔ کچھ عرصے سے مسلمانوں کو کچھ امید پیدا ہو چلی تھی، لیکن اب ان کی امید کا درخت جس کی شاخیں کچھ سرسبز ہو رہی تھیں، پھر سے خشک ہونے لگا ہے۔"

مضمون نگار نے آخر میں یہ سوال کیا ہے کہ "کیا اُردو زبان کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں سے خارج کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ دیوناگری کو دی جائے گی جو مسلمانوں کے لیے کبھی بھی قابلِ قبول نہ ہوگی۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے کی اس واسطے ضرورت ہے کہ یہ حکومت کی زبان ہے۔ اب کیا ان کے لیے یہ بھی لازمی ہوگا کہ وہ ان کی زبان سیکھیں جو ان کے ایک زمانے میں محکوم تھے؟ ہندی زبان کا رسمِ خط بدنما اور بھدا ہے۔ اس میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں جو ایک

مُردہ زبان ہے اور جیسے مُردہ زبان ہوئے ایک ہزار سال سے بھی زائد ہوئے۔ ہندی کو ترقی دے کر اُردو کو فنا کیا جا رہا ہے جس کی آب یاری عربی اور فارسی جیسی زندہ زبانوں کے سرچشموں سے ہوتی ہے اور جس کا خوش نما رسمِ خط آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے اور جو سیکڑوں برسوں سے ہندُستان کے ہر گوشے میں قبولیت حاصل کر چکا ہے لیکن ایسا کرنے میں کام یابی حضرت مسیح کے معجزوں سے کم نہ ہوگی۔ اگر انگریزی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ہندی کو رواج دے کر وہ ہندوؤں کی خواہش کی ترجمانی کر رہی ہے تو اس کو چاہیے کہ اضلاع کے مجسٹریٹوں کے ذریعے کمیٹیاں قائم کرا کے اس امر کی تحقیقات کرائے کہ آیا واقعی ہندوؤں کی اکثریت دیو ناگری رسمِ خط کو اختیار کرنے کے موافق ہے۔ لیکن اگر ان چند ہزار اشخاص کے علاوہ جنھوں نے بابو شیو پرشاد کی عرض داشت پر دست خط کیے ہیں، دوسرے ہندو لوگ دیو ناگری کی تائید میں نہیں ہیں تو حکومت کو اس کی موافقت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بابو صاحب اور ان کے ہم خیال اشخاص پر یہ ذمے داری عائد ہوئی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ ہندستان کی ۱۴ کروڑ مخلوق میں سے اکثریت یا کم از کم ۶ یا ۷ کروڑ دیو ناگری رسمِ خط کی حمایت میں ہیں اس لیے کہ صرف مدرسوں کے طلبا کے دست خطوں سے ایسے اہم معاملے کا فیصلہ نہیں ہونا چاہیے۔

بہ ہر حال اس میں شبہے کی گنجایش نہیں کہ اگر حکومت
نے دیوناگری رسم خط کی حمایت کا تہیہ کر لیا تو مسلمانوں
کو اس سے بڑا نقصان پہنچے گا اور وہ جہالت کے
دَلدل میں پھنس جائیں گے۔ اُردو کے توسط سے وہ
عربی اور فارسی کے سرچشموں تک بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں
جو ان کے نزدیک نہایت اہم زبانیں ہیں۔ اور حقیقت
تو یہ ہے کہ بہت سے ہندو بھی جو اُردو زبان اور اُردو رسم خط
کے عادی ہیں، ان درختوں کے مماثل ہو جائیں گے
جن کی جڑیں کسی نے اکھاڑ دی ہوں"۔

"یہ دعوا بلند آہنگی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دیوناگری
رسم خط بہ نسبت اُردو رسم خط کے زیادہ واضح ہوتا ہے اور
اس میں جعل سازی بہت دُشوار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے
کہ اگر اُردو رسم خط میں ہر طرح کی سہولت نہ ہوتی تو
صدیوں سے اس کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ دراصل
دیوناگری رسم خط میں طوالت ہوتی ہے اور اس کی تحریر
میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ جس تحریر کے
لیے اُردو میں ایک منٹ درکار ہوتا ہے اس تحریر کے
لیے دیوناگری میں چھ منٹ صرف ہوتے ہیں۔ اور جو
لوگ جعل سازی کرتے ہیں انھیں نہ اُردو تحریر میں ایسا
کرنے سے کوئی روک سکتا ہے اور نہ دیوناگری میں۔ اگر
اُردو کی جگہ دیوناگری رسم خط حکومت نے اختیار کر لیا تو

مسلمانوں کے لیے سرکاری دفاتر میں ملازمتیں باقی نہیں
رہیں گی۔ ویسے بھی سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کی تعداد
بہت کم ہے اور جو مسلمان سرکاری ملازمت میں ہیں وہ
ادنا خدمات پر فائز ہیں۔ اگر دیوناگری کی تجویز منظور ہو گئی
تو ان کی تعداد سرکاری دفاتر میں اتنی بھی باقی نہیں
رہے گی۔[1]

۱۵ نومبر ۱۸۷۱ء کو لندن کی انجمنِ فنون کے روبرو سید امیر علی خاں نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں ہندستانی زبان کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "مجھے جن زبانوں کا علم ہے ان میں ایک بھی ایسی نہیں جو فصاحت و بلاغت میں ہندستانی کا مقابلہ کر سکے یا جس کا ذخیرۂ الفاظ اس کی طرح مالا مال ہو۔ پنجاب سے لے کر (بھاگل پور) بنگال تک وہ بولی جاتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اکثر ہندوؤں کی بھی قومی زبان ہے۔ بنگال میں بھاگل پور سے بنگالی زبان شروع ہوتی ہے۔ بنگال میں صوبہ جاتِ شمال مغربی اور بہار سے آکر جو مسلمان آباد ہو گئے ہیں، وہ بنگالی بہت کم سمجھتے ہیں۔ بنگال کے اکثر شمالی اضلاع میں اُردو زبان بولی جاتی ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ وہ دہلی اور لکھنؤ کی اُردو کی طرح فصیح نہیں ہوتی۔ مشرقی بنگال کے مسلمان بھی اکثر اُردو بولتے ہیں۔ بنگالی ان میں سے بہت بولتے ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ بنگالی زبان مسلمانوں کے عہدِ حکومت کے مقابلے میں آج کل زیادہ استعمال ہونے لگی ہے۔"[2]

---

[1] اخبار الاخیار۔ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۸۷۲ء

کالجوں اور اسکولوں میں ہندستانی زبان کے رواج کے متعلق مسٹر ایچ۔ جے کارٹر کی رائے قابلِ وقعت ہے۔ موصوف بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سابق معتمد ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنے ایک خط میں (مورخہ ۲۵ جنوری ۱۸۷۲ء) لکھا ہے:- "جہاں تک میرا تعلق ہے میری رائے ہے کہ ہندستانی زبان سرکاری مدارس میں ذریعۂ تعلیم ہونی چاہیے۔ انگریزی حکومت کے لیے بھی یہ بات مناسب ہوگی کہ اہلِ ہند کو بجائے انگریزی میں تعلیم دینے کے ملکی زبان میں تعلیم دی جائے۔

سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر صوبہ جاتِ شمال مغربی بھی متذکرۂ بالا رائے سے متفق ہیں۔ موصوف کو اہلِ ہند میں بڑی ہر دل عزیزی حاصل ہے اور جب موقع ملتا ہے وہ ہندستانی زبان میں بلا تکلف اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں موصوف کو ہندستانی زبان پر جو قدرت حاصل ہے اس کا ثبوت ان کی حالیہ تقریر سے ملتا ہے جو انھوں نے مرادآباد کے دربار میں "تاریخ یکم نومبر ۱۸۷۱ء کی تھی۔ اس دربار میں نواب رام پور اور روہیل کھنڈ کے امرا نے شرکت کی۔ سر ولیم میور نے اپنی تقریر کے دوران میں بیان کیا کہ انگریزی حکومت مذہبی معاملات میں انتہائی رواداری برتتی ہے اور مذہبی آزادی کا اصول جس پر سرکارِ انگریزی عمل پیرا ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ تقریر کے دوران میں موصوف نے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار برجستہ پڑھے اور ان کے ساتھ ہندی کا ایک دوہا بھی پڑھا۔ تقریر میں اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ اہلِ ہند اپنے بچوں کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام کریں اور حتی الامکان مذہبی اور نسلی امتیازات کو

آپس میں کم کرنے کی کوشش کریں۔

ہندُستان کے نئے وائس رائے لارڈ ناتھ بروک نے بھی مختلف موقعوں پر اپنی تقاریر میں مقامی زبانوں اور خاص کر ہندستانی زبان میں تعلیم دینے کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔

لیکن بایں ہمہ بعض لوگ مستقل طور پر باقاعدہ ہندستانی زبان کی مخالفت پر کمر بستہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وولوچ کی شاہی اکاڈمی میں ہندستانی تعلیم کا انتظام کیوں نہیں کیا گیا۔ ایک بیرسٹر نے انڈین میل کے اڈیٹر کو لکھا ہے اور اس کی نسبت شکایت کی ہے۔ بیرسٹر موصوف نے لکھا ہے کہ ہندستانی زبان کی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہے اس واسطے کہ فوج کے تین چوتھائی افسر جو اس کالج سے نکلیں گے، ہندستان میں چند سال تک ضرور رہیں گے۔ اس سے کیا فائدہ کہ ہندستانی کے بجائے ان افسروں کو جرمن، لاطینی اور یونانی سکھاتی جاتی ہے جو مطلق ان کے کام نہیں آئیں گی۔ اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ انگریز افسروں کے لیے اس میں زیادہ سہولت ہوگی کہ وہ ہندستانی زبان ہندستان جا کر سیکھیں۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ گرم آب و ہوا میں اکثر لوگ سست ہو جاتے ہیں۔ اگر فوجی افسروں کو ہندستانی زبان کے اصول اس وقت سکھا دیے جائیں جب کہ وہ انگلستان میں زیرِ تعلیم ہیں تو وہ مشق سے اور ہندستان میں رہ کر اس زبان کی تحصیل مکمل کر سکتے ہیں۔

اس کی بڑی ضرورت ہے کہ سرکاری عہدے دار مروجہ زبانوں سے واقفیت رکھتے ہوں۔ لیکن اس وقت ہندستان میں ایسا نہیں ہے۔

چناں چہ دیسی اخباروں میں ایسے سرکاری عُہدے داروں کے خلاف شکایات شایع ہوتی رہتی ہیں جو عوام کی زبان سے نابلد ہوتے ہیں۔ ان شکایات کے ساتھ اس خواہش کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ سرکاری عُہدے داروں کا اپنی خدمات پر مامور ہونے سے پیش تر مروجہ زبانوں میں سے ایک میں باقاعدہ امتحان لینا چاہیے۔

لاہور کے یونی ورسٹی کالج کی تجاویز کی بدولت کلکتہ یونی ورسٹی کی سینیٹ نے اپنی یہ غلطی تسلیم کی ہے کہ وسطانیہ کے امتحانات میں مقامی زبان میں جواب دینے کی طلبا کو اجازت ہونی چاہیے۔ دراصل مقامی زبان میں امتحان دینے کی اجازت نہ ہونے کے باعث بہت سے ہندستانی نوجوان شرکت نہیں کر سکتے۔ یہ ان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں یہ قاعدہ ہے کہ امتحانات یا تو ملکی زبان یا قدیم زبان کے توسط سے ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان اہلِ ہند کے لیے نہ تو ملکی زبان ہے اور نہ اس کی حیثیت ان کی قدیم زبان کی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ کلکتہ یونی ورسٹی نے بالآخر ہندستان کی مروجہ زبانوں کی حیثیت کو تسلیم کر لیا اور اس باب میں اپنے فرض کو پہچانا۔ چناں چہ ۱۲ مئی ۱۸۷۰ء کو سینیٹ کے جلسے میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ ملکی زبان کے ذریعے جوابات کی وسطانیہ کے امتحانات میں اجازت ہوگی۔ ملکی زبانوں میں ہندستانی کے ماسوا بنگالی، اُڑیا اور آسامی شامل ہیں۔ امیدوار کو اجازت ہوگی کہ ان میں سے کسی زبان میں سوالات کے جواب دے۔ وسطانیہ کے امتحان کے بعد جو صداقت نامے کام یاب امیدواروں کو دیے جائیں گے وہ بھی

امید وار کی مقامی زبان میں ہوں گے۔ اس کے متعلق گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے ضروری قواعد وضوابط نافذ کر دیے ہیں اور ان کا سرکاری طور پر باقاعدہ اعلان کر دیا گیا ہے۔[1]

کلکتہ یونی ورسٹی کے اس فیصلے سے ملکی زبانوں کو فروغ حاصل کرنے کا پورا موقع ملے گا۔ بالخصوص ہندستانی زبان کی وسعت میں اس کی وجہ سے بہت مدد ملے گی جو پنجاب، صوبہ جاتِ شمال مغربی، اودھ، بہار، صوبہ جاتِ متوسط و دکن اور بنگال کے ایک حصے میں بولی جاتی ہے اور جس کو بجا طور پر "قومی زبان" کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح ہندستانی اور انگریزی میں مقابلہ ہوگا کہ کون سی زبان مقبولیت حاصل کرتی ہے۔ وسطانیہ کے امتحان میں امیدوار کی جانچ صرف و نحو اور مادری زبان کی انشا کے علاوہ ریاضی، تاریخ اور جغرافیے میں کی جائے گی۔

کلکتہ یونی ورسٹی کی سینیٹ نے جو تجویز منظور کی ہے اس سے مسلمان بہت خوش ہیں اس لیے کہ انھیں اب اس کا موقع حاصل ہوگا کہ بغیر انگریزی پڑھے ہوئے وسطانیہ کے امتحان میں شرکت کر سکیں۔ وہ اس امتحان میں انگریزی کی بجائے فارسی یا عربی لے سکتے ہیں جو ان کی قدیم زبانیں ہیں۔

بہار کی علمی مجلس (سائنٹفک سوسائٹی) کا صدر مقام مظفر پور ہے۔ اگرچہ یہ انجمن ۱۸۶۸ء میں قائم ہوئی ہے لیکن اس کے ارکان کی تعداد پانسو ہو چکی ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ چند انگریز بھی اس انجمن میں شریک ہیں۔ کلکتہ یونی ورسٹی کی سینیٹ نے

---

[1] اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۱۵ مارچ ۱۸۷۰ء

وسطانیہ مدارس کے امتحانات کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اس میں انجمن کے اثر کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ اس فیصلے سے بہت سے اہلِ ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو گیا ہے جو سرکاری ملازمتوں کے لیے انگریزی کو لازمی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اس سے انگریزی حکومت کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہوگا۔ اودھ کی پولیس کے انسپکٹر جنرل نے اس صوبے کے ناظمِ تعلیمات سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر سال ۴۰ مسلمانوں کو اپنے محکمے میں ملازمت دے گا بشرطے کہ وہ ہندستانی لکھ پڑھ سکتے ہوں اور ریاضی سے واقف ہوں۔ مدراس کے لفٹنٹ گورنر لارڈ ہوبرٹ بھی مسلمانانِ ہند کے ساتھ خاص ہم دردی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پچاس مسلمانوں کی ایک فہرست پہلے سے تیار کرلی ہے جنھیں سرکاری خدمات خالی ہونے پر فوراً ملازم رکھ لیا جائے گا۔ موصوف نے حکومت کی ایک تجویز کا بھی اعلان کیا کہ مسلمانوں کے لیے علاحدہ مخصوص مدارس کھولے جائیں گے جن میں ہندستانی زبان میں تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ سرکاری خدمات حاصل کرسکیں۔

بہار کی سائنٹفک سوسائٹی نے لفٹنٹ گورنر بنگال کی شکرگزاری کے لیے ایک ایڈریس پیش کیا ہے جس میں اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ وسطانیہ جماعتوں کا مادری زبانوں میں امتحان لینے سے لوگوں کو کس قدر فائدہ پہنچا ہے۔[۱] اس ایڈریس میں اس متذکرہ بالا اصلاح کے یہ فائدے بتائے گئے ہیں:۔ (۱) دیسی طلبا کی رسائی سائنس تک ہو سکے گی۔ (۲) اہلِ ہند کے دلوں میں ملکہ معظمہ کی قدر و منزلت

[۱] اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار۔ مورخہ ۱۵ اپریل ۱۸۷۲ء

بڑھے گی اس واسطے کہ ان محترمہ نے ان کی اس دُشواری کو محسوس فرمایا جو انگریزی زبان میں وسطانیہ کا امتحان لازمی رکھنے سے انھیں پیش آتی تھی اور ہندُستانی زبان اور ان کی قدیم زبانوں کو ترقی کا موقع عطا فرمایا جن میں ان کے مذہبی علوم ہیں۔ اس ایڈریس میں سوسائٹی کی جانب سے ان مقاصد کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس کے پیش نظر ہیں۔ یعنی حکومت کی مدد سے دیسی زبانوں کی تعلیم کے لیے مدارس قائم کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے مدارس قائم کرنا جن میں انگریزی زبان اور مغربی علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہو۔ سوسائٹی کے ایک مجلہ کے ذریعے عام معلومات کی نشرواشاعت کرنا۔ یہ مجلہ ہندستانی زبان میں ہوگا اور اس میں علمی اور ادبی دونوں قسم کے مضامین شایع ہوں گے۔ سوسائٹی نے توقع ظاہر کی ہے کہ عنقریب وہ پٹنہ میں ایک کالج قائم کرنے والی ہے جہاں ہندستانی کے ذریعے مغربی علوم پڑھائے جائیں گے۔

علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے تعاون عمل سے بہار کی سائنٹفک سوسائٹی نے پانچ کتابیں شایع کی ہیں اور بارہ کتابیں زیر ترجمہ ہیں۔ اس کے کتب خانے میں عربی کی مزید ۷۰ کتب کا اضافہ ہوا ہے جو مصر میں طبع ہوئی ہیں۔ انگریزی کی ۱۳۰ کتب کا اضافہ ہوا ہے جو مختلف علوم و فنون اور فلسفے سے تعلق رکھتی ہیں۔ انجمن کے معتمد نے بعض فاضل انگریزوں کے مشورے سے یہ کتب منگائی ہیں۔

مظفر پور کے کالج کے علاوہ جہاں ہر شخص اس امر کی تشفی حاصل کرسکتا ہے کہ مغربی علوم و فنون کس قدر سہولت کے ساتھ ہندُستانی

زبان کے ذریعے پڑھائے جاسکتے ہیں، سائنٹفک سوسائٹی بہار نے ترہوٹ اور دوسرے اضلاع میں متعدد مدارس قائم کیے ہیں۔ اگر حکومت نے سوسائٹی کی اعانت کی تو توقع ہو کہ بہت جلد وہ اور مدرسے قائم کردے گی۔ اب تک سوسائٹی کا کُل سرمایہ چندوں اور عطیات پر مبنی ہو اور بہت سے امرا اور زمیں دار لوگ اس کی مالی امداد کرتے رہے ہیں۔ اس ایڈریس میں جو لفٹنٹ گورنر بنگال کو پیش کیا گیا مُعطیوں کے ناموں کی فہرست اور ان کے عطیات کی رقوم درج ہیں۔

اگرچہ یہ دُرست ہو کہ جن طلبا نے مغربی علوم کی تحصیل کی ہو انھیں سرکاری ملازمت کو اپنا مقصدِ حیات نہیں بنانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ حکومت کا یہ فرض باقی رہتا ہو کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق تعلیم یافتہ ہندستانیوں کو خدمات دے، چاہے وہ انگریزی زبان سے واقفیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ اگر حکومت نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی عزّت بڑھ جائے گی اور ان میں خود بخود انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا جس کے ترجموں کے ذریعے وہ علوم (سائنس) حاصل کرتے ہیں۔

مظفر پور کے سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد ۷ نومبر ۱۸۷۱ء کو بنگال کے لفٹنٹ گورنر مسٹر جی۔ کیمبل نے رکھا۔ یہ کالج بیچ شہر میں آموں کے جھنڈ میں واقع ہو۔ اُس روز صبح ہی سے ہزاروں آدمی اس تقریب میں شرکت کے لیے خیموں تلے جمع تھے۔ اس موقع پر تین تقاریر ہوئیں۔ مولوی سیّد امداد علی نے ہندستانی میں

تقریر کی۔ ڈاکٹر فیلن نے انگریزی میں اور مسٹر جی کمبل نفٹنٹ گورنر بنگال نے بھی انگریزی زبان میں تقریر کی۔ نفٹنٹ گورنر بنگال نے دورانِ تقریر میں کہا کہ مَیں انجمنِ بہار کے ان خیالات کی تائید کرتا ہوں جو اس نے پٹنہ کالج کے متعلق ظاہر کیے ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ عوام کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور تعلیمی ترقی کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ابتدائی اور وسطانی تعلیم ملکی زبان کے ذریعے دی جائے۔ اس سے یقیناً مسلمانوں کو فائدہ ہوگا اس لیے کہ وہ اب تک سرکار کے مدرسوں اور کالجوں سے دور رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی مادری زبان اور اپنی قدیم (کلاسکی) زبانوں سے محبت ہے۔ موصوف نے کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انجمنِ بہار نے جو مدارس قائم کیے ہیں، ان میں نصف تعداد طلبا کی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ موصوف نے یہ بھی کہا کہ مَیں ہندستانی زبان کا دل سے ہوا خواہ ہوں جہاں تک کہ اس کی اشاعت کا پنجاب اور صوبہ جاتِ شمال مغربی سے تعلق ہے، ان علاقوں میں اس زبان کے ذریعے سب کارروائیاں ہوتی ہیں اور انگریزی کو اب تک کم رواج حاصل ہوتا ہے۔ لیکن صوبۂ بہار کے حالات دوسرے ہیں۔ اس کا تعلق صوبۂ بنگال سے ہے جہاں انگریزی زبان نے جڑ پکڑ لی ہے۔ اس لیے یہاں بجائے قدیم مشرقی زبانیں سکھانے کے انگریزی کی تعلیم پر زور دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ بلاشبہہ سنسکرت زبان میں مٹھاس پائی جاتی ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی بہت وسیع ہے۔ اس کا تعلق یورپ کی اکثر السنہ سے ہے اسی طرح عربی زبان بھی ایک جان دار زبان ہے

اور اس میں فلسفہ اور تاریخ کے بیش بہا خزانے موجود ہیں۔ لفٹنٹ گورنر بنگال نے کہا کہ ان زبانوں کے متعلق ان کا وہی خیال ہو جو یورپ کی کلاسکی زبانوں کے متعلق ہو۔ موصوف نے کہا کہ انگلستان میں ان قدیم زبانوں کے سکھانے پر بے کار بہت وقت ضائع کیا جاتا ہو موصوف نے آخر میں اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ قدیم زبانوں کی تعلیم اختیاری ہونی چاہیے اور انگریزی اور سائنس کی تعلیم کو لازمی رکھنا چاہیے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنی مذہبی کتابوں کو سمجھنے کے لیے مسلمان لوگ عربی اور فارسی سیکھیں لیکن ان زبانوں کو ذریعۂ تعلیم تو نہیں بنایا جا سکتا اگر ملک کی کسی زندہ زبان میں تعلیم دینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تو بہتر ہوگا کہ انگریزی ہی ذریعۂ تعلیم رہے۔ مغلوں کے عہدِ حکومت میں فارسی سیکھنی پڑتی تھی۔ اب جب کہ ہندستان میں انگریزی حکومت نے امن وامان قائم کیا ہو تو اگر اہلِ ہند میں انگریزی زبان کی اشاعت کی جاتے تو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہیے۔ پھر انگریزی زبان کے پھیلنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ اہلِ ہند مغربی علوم وفنون سے آگاہ ہوں گے جس سے انھیں بہت سے فوائد حاصل ہوں گے۔ اگرچہ حکومت نے وسطانیہ مدارس کی تعلیم کے لیے یہ سہولت بہم پہنچا دی کہ مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جاتے لیکن اگر طلبا انگریزی زبان سیکھیں گے تو انھیں آیندہ یونی ورسٹی کی ڈگری حاصل کرنے میں آسانی ہوگی اس لیے کہ یونی ورسٹی میں قدیم مشرقی زبانوں سے واقفیت کام نہ آتے گی اور انگریزی کے توسط سے مغربی علوم (سائنس) حاصل کرنے میں بے حد سہولت ہوگی۔

ان چند باتوں کا ذکر کرنے کے بعد لفٹنٹ گورنر بنگال نے مولوی امداد علی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مَیں چوں کہ زبان سے ناواقف ہوں اس لیے تقریر کا بہت کم حصّہ سمجھ سکا اور مشکل سے یہ فرق کر سکا کہ ان کی تقریر اُردو میں تھی یا فارسی زبان میں۔ تعجب ہے کہ باوجود اس کے کہ لفٹنٹ گورنر بنگال اُردو زبان سے ناواقف ہیں لیکن انھوں نے اس قسم کی تنقید کو روا رکھا۔ اس ضمن میں موصوف نے یہ بھی کہا کہ اُردو دیسی زبان نہیں ہے اور تعلیمِ عامہ میں اس کو رواج نہیں دیا جاسکتا لیکن ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ لفٹنٹ گورنر بنگال کے نزدیک دیسی زبان سے کیا مُراد ہے؟ کیا دیسی زبان ان کے نزدیک وہ ہے جو فوجی لوگ یا قُلی بولتے ہیں؟ افسوس ہے کہ وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ دیسی زبان کا اطلاق جیسا ہندستانی اُردو پر ہوتا ہے کسی اَور زبان پر نہیں ہوتا۔ یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل سے پیدا ہوئی۔ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بالکل فطری طریقے پر شامل ہوتے۔ عربی کے لفظوں نے اصل فارسی ہی کی راہ سے اس زبان میں بار پایا۔ اس زبان میں بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح بول چال کے محاورے علمی اور ادبی زبان سے مختلف ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ مسلمان اُردو میں ایسے بہت سے لفظ استعمال کرتے ہیں جو عام بول چال میں نہیں برتے جاتے۔ ظاہر ہے کہ لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال کو یہ بات ہرگز پسند نہ ہوتی کہ کوئی انھیں ایسی زبان میں خطاب کرے جو رکیک اور بازاری ہو۔ مولوی امداد علی نے جو طرزِ خطاب اس موقع پر اختیار کیا وہ حسبِ حال اور موزوں تھا۔ مشرق

کی اور دُوسری زبانوں میں بھی سوائے عربی کے ہمیں یہ بات ملتی ہی۔ چناں چہ ترُکی اس باب میں ہندستانی سے بہت کچھ ملتی جُلتی ہی۔ ترکی میں بھی بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو ترکی لفظ کے ساتھ عربی اسم کے ملانے سے بنائے جاتے ہیں۔ ترُکی مصنفین اپنی تحریروں میں عربی اور فارسی کے الفاظ بلا تکلّف استعمال کرتے ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہی کہ ان کی تحریر کو لوگ نہیں سمجھتے؟ مشرقی زبانوں کی اس خصوٗصیت کو ہمیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ خوٗد انگریزی زبان میں لاطینی محاورے استعمال ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے جلسوں میں اراکین، ورجل' اور 'ہوریس' کے اشعار لاطینی زبان میں پڑھتے ہیں اور کوئی شخص اعتراض نہیں کرتا۔

مسٹر جی کمبل لفٹنٹ گورنر بنگال نے ہندستانی اُردوٗ کے خلاف جو تقریر کی اور جس میں مولوی امداد علی کی زبان کو معرضِ بحث میں لایا گیا وہ دراصل ان کے ایک اور اہم بیان کا پیش خیمہ تھی جسے ہم سرکاری کہہ سکتے ہیں۔ ہماری مُراد ہی اس یادداشت سے جو دلیسی زبانوں میں تعلیم دینے کے متعلق ۲۹ دسمبر ۱۸۷۱ء کو شایع کی گئی ہی۔ کوئی شخص اس کا گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس قسم کی تحریر خوٗد اعتمادی کے ساتھ حکومت کے سامنے پیش کی جائے گی ہمیں پوری توقع ہی کہ نئے وائس رائے بہادر اس تحریر کو منسوخ قرار دیں گے۔ یہ تحریر اس قدر عجیب وغریب اور غیر متوقع ہی کہ ہم یہاں اس کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں:۔

"فارسی زبان کو جو ہندستان کے قدیم حکم رانوں کی زبان تھی، کلیتاً ترک کر دیا گیا ہے۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے (لفٹنٹ گورنر بنگال) ہندستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کر دی گئی تھی۔ میری خدمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پورے طور پر کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ہوں جو فارسی انشا پردازوں کو بہت عزیز تھے[۱] میرا خیال تھا کہ یہ زبان بالکل متروک ہو چکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے لفظ استعمال ہوتے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بہار میں میں نے جو زبان سُنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی[۲] ایسی مصنوعی زبان میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو

---

[۱] ان الفاظ سے ہندستانی کے الفاظ مُراد ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ خود انگریزی زبان کے اکثر الفاظ دوغلے ہیں جیسا کہ گلکرسٹ نے بار بار کہا ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی بھی دوغلی زبان ہوئی۔

[۲] مصنوعی سے کیا مُراد ہے؟ ہر زبان جو صَرف و نحو کے قواعد کے مطابق بولی جاتی ہے ایک حد تک مصنوعی کہی جا سکتی ہے۔

ہمارے مدارس میں دیسی زبان (ورنیکلر) کہا جاتا ہی مولوی لوگ جو زبان مروجہ زبان کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ اس زبان کے لیے "اُردُو" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہی جو نہایت غیر موزوں ہی۔ مَیں سمجھتا ہوں یہ لفظ بنگال کے محکمہ تعلیمات نے رائج کیا ہی۔ یہ ایک ایسا لفظ ہی جس کے معنی متعین نہیں کیے جا سکتے۔ کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کوئی کچھ لکھے لیکن حقیقت یہ ہی کہ اُردُو زبان اہلِ دربار اور دہلی کی طوائفوں کی زبان ہی۔ اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے۔ مَیں نے پورا ارادہ کر لیا ہی کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہی، روکنے کی کوشش کروں گا۔ مَیں فارسی زبان کے مداحوں میں ہوں۔ یہ ایک نفیس اور پُرتکلف زبان ہی۔ اگر فارسی زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ حالات ایسا کرنے کے موافق ہوں لیکن بگڑی ہوئی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے میل سے جو زبان تیار کی گئی ہی جس میں ہندستانی کے کچھ تھوڑے سے افعال و حروفِ عطفیہ (Conjunctions) شامل کر لیے گئے ہیں، جسے اُردُو کہتے ہیں، ہرگز اس قابل

کہ اس کی تعلیم دی جائے۔ مجھے بنگالی زبان نہیں آتی
لیکن مجھے یقین ہو اس زبان میں بھی بہت میل پیدا
ہو گیا ہو اور اس میں سنسکرت کے لفظ اور محاورے
بے تحاشا شامل کر لیے گئے ہیں[1]۔ بہار کے مدارس میں
جو مروّجہ زبان میں تعلیم دی جاتی ہو وہ تمام تر اس پر
مشتمل ہو کہ ایک مولوی صاحب اُردو پڑھا دیتے ہیں
اور ایک پنڈت جی ہندی میں لکھے ہوئے چند سورماؤں
کے تاریخی حالات بتا دیتے ہیں۔ اس تاریخ میں ہر
دوسرے یا تیسرے صفحے پر سنسکرت کے شلوک ضرور
ہوتے ہیں۔ ہندی کے متعلق میری رائے ہو کہ اس میں
خواہ مخواہ سنسکرت کے لفظوں کی ٹھونس ٹھانس نہیں
ہونی چاہیے اور نہ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ہندی کا نام لے کر
ہر گانو کی علاحدہ بولی کو تسلیم کریں۔ ایسا کرنا بالکل اس
کے مماثل ہو گا کہ انگلستان میں بچوں کو 'ڈورشیٹ شائر'
یا 'یارک شائر' کی بولیاں سکھائی جائیں[2]۔ ہندستان
کی ایک زبان کُل ملک کے لیے ہی جو ہندستانی کہلاتی ہو

---

[1] غالباً اُردو سے ناواقفیت کی بنا پر لفٹنٹ گورنر بنگال نے اس کے متعلق اپنی یہ رائے ظاہر کی ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ بغیر سنسکرت الفاظ کے بنگالی کی کیا حیثیت رہ جائے گی اس کا جواب ریورنڈ جے لانگ اور مسٹر جان بیمز دے سکیں گے۔

[2] اس کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہو کہ ہندستانی بچوں کو نہ ہندی سکھائی جائے اور نہ اُردو بلکہ انھیں صرف انگریزی پڑھائی جائے۔

بالکل اس طرح جیسے انگلستان میں انگریزی ہی۔ میری دانست میں اہلِ بنگال کی زبان اسی طرح بنگالی کہی جاسکتی ہی، لیکن چوں کہ بنگالی زبان ابھی حال ہی میں وجود میں آئی ہی اس لیے بول چال کی بنگالی اور تحریر کی بنگالی میں فرق کرنا ہوگا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اُردو میں سے فارسی الفاظ چُن چُن کر علاحدہ کر دیے جائیں۔ یہ ہندستانی زبانوں کی خصوصیتِ خاصہ معلوم ہوتی ہی کہ وہ کسی اجنبی زبان کے محاورے اور لفظ کسی مطلب کو ادا کرنے کے لیے آسانی سے اپنے میں شامل کرلیتی ہیں اس واسطے کہ خود ان میں اس کے ادا کرنے کے لیے لفظ موجود نہیں چناں چہ ہندستانی زبانوں میں بہت سے فارسی الفاظ نے راہ پائی۔ اسی طرح انگریزی لفظ بھی اپنائے جا رہے ہیں اور غالباً آیندہ اور زیادہ اپنائے جائیں گے۔ یہ دوسری زبانوں کے لفظ جو ہندستانی زبانوں میں اپنائے گئے ہیں، بچّوں کو سکھانے ہوں گے[۱] ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچّوں کو جو زبانیں سکھائی جائیں وہ ملک کی حقیقی زبانیں ہونی چاہییں جو عام طور پر

---

[۱] یہ خیال بہت اچھا ہی۔ ایسے لفظ جو ہندستانی زبانوں میں داخل ہو گئے ہیں اور جن سے لوگ مانوس ہیں عام طور پر عربی اور فارسی کے لفظ ہیں۔ مثلاً سلام، صاحب، شراب، مختار، نذر، رسالہ اور بدمعاش۔ اسی طرح کے سیکڑوں اور دوسرے الفاظ ہیں جو ہندستانی زبانوں کے علاوہ انگریزی تک میں قبول کر لیے گئے ہیں۔

بولی جاتی ہیں اور جنھیں عوام الناس سمجھ سکیں[1] مصنوعی زبانیں سکھانے سے کوئی فائدہ نہیں جنھیں عام لوگ نہیں بولتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں اگر جدید تصورات کو ادا کرنے کے لیے جدید الفاظ کی ضرورت ہی تو مَیں سمجھتا ہوں یہ بہتر ہو گا کہ انگریزی الفاظ رائج کیے جائیں بجائے اس کے کہ کسی اجنبی زبان کے اجنبی الفاظ قبول کیے جائیں۔ یہ ضرورت اس واسطے پیش آئے گی کہ ہم انگریزی کی اُعلا تعلیم کے ذریعے جدید تصورات کو اہلِ ہند کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ہندی اور ہندستانی کے متعلق میرا خیال ہی کہ ان دونوں کو اس طرح سکھانا چاہیے گویا وہ دونوں ایک زبان ہوں جو دو مختلف رسمِ خط میں لکھی جاتی ہیں۔ مَیں نے ابھی جو کچھ کہا ہی اس سے اندازہ کر لیا گیا ہو گا کہ مَیں قدیم اور دقیانوسی ہندی کی ہمّت افزائی کے خلاف ہوں۔ ہندی کی جو کلاسکی کتابیں صوبہ جاتِ شمال مغربی (یو-پی) میں چھاپی جا رہی ہیں۔ ان میں فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جنھیں لوگ سمجھ سکیں۔ اگر انھی کتابوں کو فارسی رسمِ خط میں لکھا جائے تو وہ ایسی خالص ہندستانی زبان بن جائے گی جس کو رائج ہوتے دیکھنے کی میری

---

[1] کاش مسٹر کیمبل، نفٹنٹ گورنر بنگال کسی ایسی ملکی زبان کے دو ایک صفحے بہ طورِ مثال پیش کر سکتے تاکہ معلوم ہو کہ ان کی مراد کس قسم کی زبان سے ہی۔

دِلی خواہش ہی"۔
"مَیں ناظمِ تعلیمات کی توجہ مندرجۂ ذیل امُور کی جانب مبذول کراتا ہوں:۔ (۱) اُردُو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی طور پر متروک ہو چکی ہی۔ (۲) ناظمِ تعلیمات اور مہتمانِ تعلیمات کو ہدایت کی جاتی ہی کہ وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہو جس کے متعلق اُوپر ذکر کیا جا چکا ہی[۱] (۳) اس قسم کی کتابیں جو نصاب میں شامل کی جائیں، ان کی فہرست مجھے بھیجی جائے۔ مجھے اس میں مطلق شبہہ نہیں ہی کہ صوبہ جاتِ شمال مغربی میں ہندی اور ہندُستانی کی جو کتابیں شایع کی جارہی ہیں وہ نصابی ضرُوریات کو پورا نہیں کرسکتیں۔ اگر ہندستانی میں کلاسکی کتب کی کمی ہی تو اس کمی کو اس طرح پورا کیا جاسکتا ہی کہ ہندی کی کتب کو فارسی رسمِ خط میں چھاپ دیا جائے جس کے متعلق مَیں ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن بنگالی میں ایسی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جن سے ہماری ضرُوریات کما حقہٗ پوری ہوتی

---

[۱] دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ایسی ہندی پڑھائی جائے جس میں فارسی لفظ اور فارسی رسمِ خط میں وہ لکھی جائے۔ یہ عجب بات ہی کہ اس پر اتنی تنقید کر چکنے کے بعد اس زبان کو اس قابل سمجھا جاتا ہی کہ وہ کام آسکتی ہی۔

ہیں۔ اگر ان کتب کو علاحدہ کر دیا جائے جن میں سنسکرت
کا عنصر غالب ہو یا جن کی عبارت مصنوعی ہو تو بھی ایسی
کتابیں ہمارے پاس بچ جائیں گی جو مروّجہ بنگالی زبان
میں لکھی گئی ہیں جن سے ہماری مقصد برآری ہو سکتی
ہو۔ (۴) اگر تعلیمات کے کسی شعبے میں ایسی کتب موجود
نہ ہوں جو مروّجہ زبان میں لکھی گئی ہوں تو اس کے
متعلق مجھے خاص رپوٹ بھیجنی چاہیے۔ مَیں ان کتب
کی فراہمی کا انتظام کروں گا۔"

"مَیں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان
کی تعمیل تمام سرکاری عہدے داروں پر عائد ہوتی ہو
تاکہ وہ اپنے دفاتر میں سوائے مروّجہ زبان کے دوسری
زبان کا استعمال نہ ہونے دیں سوائے انگریزی زبان
کے۔ انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہو
وہاں وہ علیٰ حالہٖ رہے گی مجھے توقع ہو کہ ہائی کورٹ
بھی اس بارے میں ہمارا ہاتھ بٹائے گا۔ مجھے پورا یقین
ہو کہ ہائی کورٹ جج میری طرح دیسی زبانوں کے غلط
استعمال کے خلاف ہوں گے۔"

مسٹر کمبل لفٹنٹ گورنر بنگال کی دیسی زبانوں کے متعلق یہ
یادداشت ہی جو عجیب و غریب نوعیت رکھتی ہو۔ مَیں نے اس کو
یہاں اس واسطے درج کر دیا تاکہ یورپ میں بھی لوگ اس سے
واقف ہو جائیں۔ مجھے یقین ہو کہ یورپ میں ان خیالات کو

سُن کر وہ لوگ جو ہندُستان کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں، ناک بھوؤں چڑھائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندُستان میں بھی اس یادداشت سے لوگ خوش نہیں ہیں جیساکہ بنگال کے ناظمِ تعلیمات کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جو اس یادداشت کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ بنگال کے ناظمِ تعلیمات مسٹر ڈبلو۔ایس اٹیکنسن کے سوا محکمۂ تعلیمات کے دوسرے اعلا عہدے دار جیسے مسٹر سٹکلف، مسٹر فیلن اور مسٹر ہیڈ وغیرہ نے بھی اس کے جواب دیے ہیں۔ اگرچہ ان جوابات کا لب ولہجہ نہایت مودّبانہ ہے لیکن ان کا مفہوم واضح ہے۔ ان سبھوں نے مسٹر کمبل کے خیالات کو ناقابلِ عمل بتایا ہے اور ان کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفٹننٹ گورنر بنگال کے تصورات شرمندۂ عمل نہ ہوسکیں گے۔

انڈین ڈیلی نیوز نے مسٹر کمبل کے عجیب وغریب لسانیاتی نظریوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس اخبار نے اس کا مذاق اُڑایا ہے کہ ہندُستانی زبان بنائی نہیں جاسکتی اور اس کو سرکاری طور پر ہندستانی اُردُو کی جگہ نہیں رائج کرایا جاسکتا۔ اسی مسئلے کے متعلق لفٹننٹ گورنر بنگال اور کلکتہ یونی ورسٹی کے درمیان سخت اختلافِ رائے پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن مسٹر کمبل کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندستانی اُردُو نے جس طرح ہندوؤں کی رجعتی حکمتِ عملی کا مقابلہ کیا ہے اس طرح وہ ان کی تنقید وتعریض کا بھی مقابلہ کرلے گی۔ ممکن ہے مسٹر کمبل کے احکام کی بلا چون وچرا پابندی کی جائے اور بہار کے مدارس میں اُردُو کو ختم کردیا جائے لیکن اور دوسرے مقامات

پر اس زبان کے رواج کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم برابر جاری رہے گی۔[1] ایسے جلسوں میں جن میں انگریز اور ہندستانی دونوں شریک ہوں گے اسی زبان کے ذریعے مبادلۂ خیالات کیا جائے گا۔ حکومتِ ہند کے اس کی بابت احکام موجود ہیں کہ مقامی مجلسوں اور انجمنوں کو مقامی زبان میں اپنی کارروائیاں کرنی چاہییں۔ ان احکام کے اجرا پر عام طور سے اظہارِ اطمینان کیا گیا اور بالخصوص لاہور کی ادبی انجمن نے ان کو بہت پسند کیا۔[2] اسی ضمن میں حکومت نے عدالتوں کو بھی یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ بھی اسی زبان کو ترجیح دیں جو ان لوگوں کی عام زبان ہو جو دادرسی کے لیے آتے ہیں۔ عدالتوں کو چاہیے کہ سرکاری کاغذات میں حتی المقدور ہندستانی اصطلاحات کو رائج رہنے دیں۔ ان کی جگہ انگریزی اصطلاحات سے احتراز کیا جائے۔[3] ان باتوں کے علاوہ انڈیا آفس کا حکم موجود ہے جس کے بموجب سول سروس کے امیدواروں کے لیے ہندستانی زبان کا سیکھنا لازمی کیا گیا ہے حالاں کہ ملک کی کسی دوسری زبان کو اس قدر

---

[1] یمپور ضلع علی گڑھ کے مدرسے میں ایک ہندو مدرس نے اُردو کی جگہ ہندی کی تعلیم شروع کر دی تھی لیکن اس تبدیلی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بجائے ۸۰ طالب علموں کے ہندی کی کلاس میں صرف ۵ رہ گئے۔ (علی گڑھ اخبار۔ مورخہ ۹ اگست ۱۸۶۲ء)

[2] اخبار انجمن پنجاب۔ مورخہ ۹ جنوری ۱۸۶۲ء

[3] اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار۔ مورخہ ۱۵ اپریل ۱۸۶۲ء

اہمیت نہیں دی گئی[1]

بہار کے ایک مسلمان مضمون نگار نے جن کی نسبت میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، اس ضمن میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ پہلے تو موصوف نے مسلمانوں کی تعریف کی ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ انگریزی حکومت کی نظرِ عنایت پہلے پہل مسلمانوں پر رہی لیکن اس کے بعد حکومت کی نگاہیں بدل گئیں۔ اس عذر کی بنا پر کہ چوں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج نہیں ہے، انھیں سرکاری خدمات سے محروم کیا گیا۔ مسلمانوں نے جب اس کے خلاف احتجاج کیا تو حکومت نے وعدہ کیا کہ ان کے لیے ان کی قومی زبان (اُردو) میں وُسطانیہ کے امتحان لینے کا انتظام کیا جائے گا اور بغیر انگریزی زبان کی واقفیت کے انھیں سرکاری ملازمتیں دی جائیں گی۔ آگے چل کر مضمون نگار کہتا ہے کہ "وسطانیہ کے امتحان کی یہ رعایت جنوری ۱۸۷۲ء سے منظور کی گئی۔ اسی وقت سے آنریبل جارج کیمبل لفٹنٹ گورنر بنگال نے تہیہ کر لیا ہے کہ اُردو زبان کو بالکل مٹا کے چھوڑیں گے اور اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ اپنے اس ارادے میں کام یاب ہوں گے یا نہیں، اس کا علم خدا کو ہے لیکن بظاہر ہے کہ ایسی زبان کو مٹانا جو چھ سو برس سے سوسائٹی کے ہر طبقے میں اٹک سے لے کر چین کی سرحد تک بولی جاتی ہے، ناممکن ہے۔ یہی زبان صوبہ جاتِ

[1] ۲۳ اگست ۱۸۷۲ء کے انڈین میل میں اس خبر کی اشاعت کے ساتھ ہندستانی زبان پر سخت تنقید و تعریض کی گئی ہے اور وہی دلائل پیش کیے گئے ہیں جو مسٹر کیمبل نے پیش کیے ہیں۔ ان کی یہاں تردید کرنا مجھے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

شمال مغربی (یو۔پی) اور بہار کے لوگوں کی مادری زبان ہی۔مسٹر کمبل نے اس زبان کے متعلق جو رائے قائم کی ہی کیا وہ صرف ایک شخص کی تقریر سننے کا نتیجہ ہی جس میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے گئے تھے؟[1] دراصل بول چال کی زبان علمی زبان سے مختلف ہوتی ہی۔یہ عجیب بات ہی کہ مسٹر کمبل نے صرف ایک تقریر سُن کر یہ حکم دے دیا کہ لوگوں کی زبان بدل دی جائے۔لیکن ہمیں توقع ہی کہ یہ شرمندۂ عمل نہ ہو سکے گا۔ اگر حکومت کی جانب سے ہر پانچویں سال اسی قسم کے احکام جاری ہوتے رہے تو یہ رعایا کے لیے سخت زحمت کا باعث ہوگا۔ اگر مسٹر کمبل کے جانشین نے بھی کہا کہ:

"دنیا بہت پرانی ہو چکی، اب ایک نئی کائنات درکار ہی تو اس کا نتیجہ معلوم۔لیکن چاہے کچھ ہی کیوں نہ کیا جائے انگریزی زبان ہندستان کی عام زبان کبھی نہیں بن سکتی۔"

مضمون نگار نے، جس کے مضمون کا اقتباس ہم نے اوپر درج کیا ہی، اس اختلاف کا بھی ذکر کیا ہی جو اس ضمن میں مسٹر کمبل اور کلکتہ یونی ورسٹی کے درمیان پیدا ہو گیا ہی۔مسٹر کمبل نے جس ہندستانی زبان کا ذکر کیا ہی اور جسے وہ ملکی اور دیسی زبان کہتے ہیں، اس کی شرائط اس قدر دشوار ہیں کہ ان کے مطمحِ نظر پر کسی زبان کا پورا اُترنا ناممکن معلوم ہوتا ہی۔مسٹر کمبل نے ادنا ادنا سرکاری خدمات کے لیے جو شرائط لازمی قرار دی ہیں وہ مضمون نگار کے نقطۂ نظر سے ناقابلِ عمل ہیں۔

---

[1] مولوی امداد علی کی تقریر

مسٹر کیمبل نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ تعلیم عامہ کی زبان میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں۔ موصوف نظامِ تعلیم میں بھی انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک سرکاری قرارداد کے ذریعے، جو اتنی ہی عجیب وغریب ہے جیسے کہ زبان والی قرارداد جس کی نسبت اوپر ذکر کیا جاچکا ہے، موصوف نے فیصلہ کیا ہے کہ بنگال و بہار کے مدارس کے معائنے کا کام تعلیمات کے مہتموں کے ہاتھ سے نکال کر مدرّسوں اور مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اب ناظمِ تعلیمات کی حیثیت محض محرّر کی رہ جائے گی۔ حکومت کی اس قرارداد پر سخت نکتہ چینی ہو رہی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس تجویز کو بہت جلد پسِ پشت ڈال دیا جائے گا۔[1]

مَیں نے گزشتہ سال کے مقالے میں ذکر کیا تھا کہ مشرقی الفاظ جب لاطینی رسمِ خط میں لکھے جاتے ہیں تو بعض اوقات باوجود اختلاف کے وہ یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ انگریزی حکومت چاہتی ہے کہ سرکاری طور پر مقامات کے نام ایک خاص طریقے پر لکھے جایا کریں۔ یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ چناں چہ سر ولیم میور نے اس کے متعلق وائس رائے بہ اجلاسِ کونسل کو اپنے خیالات سے مطلع کیا ہے۔[2] موصوف نے لکھا ہے کہ ایک دم سے مقامات کے نام کے ہجے بدل دینا مناسب نہیں ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی ہوگا کہ لڑکوں کے نام اور شہروں کے مکانوں کے

---

[1] Allen's Indian Mail مورخہ ۱۸ نومبر ۱۸۷۲ء

[2] انڈین میل۔ مورخہ مئی ۱۸۷۲ء۔ مسٹر ڈبلو ہنٹر نے اپنے گزیٹیر میں اس نئے اصول کے مطابق عمل کیا ہے۔

نمبر ایک جنبشِ قلم سے تبدیل کر دیے جائیں۔ اس نئے اصول کے مطابق آیندہ سے مندرجۂ ذیل نام اس طور پر لکھے جائیں گے۔

Umritsar	کے	بجاے	Amritsar
Kurrachee	"	"	Karachi
Neilgherry	"	"	Nilgiri
Allygurh	"	"	Aligarh
Umballa	"	"	Amballa
Zameendar	"	"	Zamindar

ناموں کے ہجے بدلنے سے یورپین لوگوں کو شروع میں سخت دقّت پیش آئے گی۔ مجھے خود اسما کے ہجے بدلنے میں سخت دشواری پیش آرہی ہی۔ بہت سے ہندستانی لوگوں نے نئے نئے اصول کے مطابق اپنے ناموں کے ہجے بدل ڈالے ہیں۔ چناں چہ ڈبلن کے کرائسٹ کالج کے فاضل پروفیسر اپنے کو بجاے Meer Qwlad Alee کے اب Mir Avlad Ali لکھنے لگے ہیں۔ اسی طرح Moollah Azeez Ooddeen کا نام اب Mulla Azizuddin ہو گیا۔ لیکن میرے دوست میر عبداللہ نے اپنے نام کی ہجے نہیں بدلے۔ میں انھیں ان کی اس وضع داری پر قابلِ مبارک باد سمجھتا ہوں۔

میرے خیال میں گلکرسٹ نے مشرقی الفاظ کو لکھنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہی وہ اس قدر فاضلانہ نہیں ہی جیسا کہ جونس کا طریقہ جسے حکومتِ ہند اختیار کر رہی ہی۔ ہمارے خیال میں یہ طریقِ تحریر مشرقی

الفاظ کے لیے اتنا موزوں نہیں ہی جتنا کہ انگریزی الفاظ کے لیے موزوں ہی۔ گلکرسٹ کے طریقے کو اہلِ ہند اختیار کر رہے ہیں اور اسے اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہو رہی ہی۔ مسٹر اسٹوڈس ٹی پریچرڈ نے اگرچہ موجودہ لکھنے کے طریق پر اعتراض کیا ہی لیکن ان کی یہ رائے ہی ہندستانی الفاظ لاطینی رسمِ خط میں لکھنے میں بہت سے فائدے ہیں۔ ہندستانی الفاظ جب لاطینی رسمِ خط میں لکھے جائیں تو ہجّے کے بہ نسبت تلفظ کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ موصوف نے اس بات کی بھی سخت مخالفت کی ہی کہ دوسری زبانوں کی علامات انگریزی یا یورپ کی کسی دوسری زبان میں استعمال کی جائیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ خفیف a کی آواز کے لیے u کو باقی رکھنا چاہیے اور اسی طرح i کے لیے ee اور طویل u کے لیے oo رہنے چاہییں۔ جن حروفِ صحیحہ کی آواز مشابے ہی، انھیں ایک دوسرے میں ضم کرنا بہتر ہوگا۔[1]

مَیں اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ ہندستانی ادب میں اداے مطالب کے نئے نئے انداز پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندی زبان کو ہندو لوگ سنوارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن مَیں ان لوگوں کو رجعت پسند خیال کرتا ہوں۔ خالص ہندستانی جسے اُردو کہتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہی۔ دونوں جماعتوں کے ترقی پسند افراد نے اس زبان میں کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندستان میں اس

---

[1] Allen's Indian Mail مورخہ ۱۷ جون ۱۸۶۲ء

وقت دیسی مسیحی ادبیات بھی خاص حیثیت رکھتی ہے۔ ہم اس ادبیات کو انڈو یورپین کہہ سکتے ہیں اس واسطے کہ یہ انگریزی اثر کی مرہونِ منت ہے۔ اس ادبیات کے متعلق مرشد آباد کے محمد ارشاد نے "اخبار سررشتۂ تعلیمِ اودھ" میں مندرجۂ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے۔[۵۷]

درحقیقت اس وقت دو طرح کی اُردو زبان رائج ہے۔ ایک دیسی اُردو ہے اور دوسری وہ اُردو ہے جو انگریزی اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ دیسی اُردو کو ہندستان کے شہروں کے باشندے اور شرفا و امرا بولتے ہیں۔ یہ دیسی اُردو نہایت صاف ستھری، سادہ اور ایسی فطری ہے کہ مطلب ادا کرنے کے لیے بہت سے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انگریزی اثر سے جو اُردو نکلی ہے وہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے۔ اس کی تاریخ دل چسپی سے خالی نہ ہوگی۔ یہ زبان سرکاری قواعد و ضوابط اور احکام کا ترجمہ کرنے اور اخبارات کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔ اس نئی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے جملے بہت طویل ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بعض اوقات پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس زبان میں آپ کو خالص ہندستانی زبان کے فقروں کی ساخت کہیں نظر نہیں آئے گی۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسما و صفات، فعل، فاعل، مفعول اور ضمائر دُور دُور اور آپس میں بے تعلق سے ہوتے ہیں۔ لفظوں کی ترکیبیں عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ الفاظ اور جملوں کا تعلق بعض اوقات اس قدر مصنوعی ہوتا ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لکھنے والا

---

[۵۷] ملاحظہ ہو "اخبار انجمن پنجاب" مورخہ ۲۴ / جولائی ۱۸۷۲ء

کہنا کیا چاہتا ہی۔ حکومت کے احکام کے ترجمے اور اخباروں کی خبریں اس طرزِ تحریر کے ذریعے پیش کی جاتی ہیں جو ذوقِ سلیم کو سخت ناگوار ہوتا ہی۔ پٹنہ کے ایک بزرگ نے یہ ارادہ کیا ہی کہ ہندستانی زبان میں جتنے عربی اور فارسی کے الفاظ مستعمل ہیں انھیں اس زبان سے خارج کر کے چھوڑیں گے اور ان کی جگہ انگریزی الفاظ کو رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ چناں چہ اس طرز میں انھوں نے بعض علمی کتب تالیف کی ہیں۔ لیکن اہلِ ہند کے لیے ان انگریزی الفاظ کے معنی متعین کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی اور ان میں ہزارہا لوگ ایسے ہوں گے جو ان کتابوں سے استفادہ نہیں کر سکیں گے۔ یہ صاحب جن کا میں نے ذکر کیا اور انھی کی طرح کے دوسرے ہندستانی مصنفین سمجھتے ہیں کہ اہلِ یورپ کے محاوروں کا ہُو بہُو ترجمہ کرنا اور مکھی پر مکھی مارنا گویا کمال کی بات ہی۔ ان کا یہ خیال غلط ہی کہ یورپین خیالات کو اس طرح وہ اپنی زبان میں منتقل کرلیں گے۔ اہلِ ہند نے ہر بات میں یورپین لوگوں کی نقالی پر کمر باندھی ہی تو انھیں چاہیے کہ پورے طور پر اہلِ یورپ کی زبان، لباس اور رسم و رواج اختیار کرلیں۔ ان جدّت پسندوں کا یہ خیال غلط ہی، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ حاکم جماعت کو خوش کر سکیں گے۔ یہ بات اب واضح ہو جانی چاہیے کہ حکومت چاہتی ہی کہ ہندستانی اور دوسری ملکی زبانوں کو فروغ حاصل ہو تاکہ جدید مغربی علوم کی بہترین کتب کا ان زبانوں میں ترجمہ ہو سکے اور اہلِ مشرق ان علوم سے استفادہ کر سکیں۔ حکومت کی ہرگز یہ خواہش نہیں ہی

کہ ہم اپنی زبان میں انگریزی الفاظ اور غیر ملکی محاوروں کو داخل کر کے اس کے خدوخال کو مسخ کر ڈالیں۔ لارڈ میو کے عہدِ حکومت میں جو قرارداد حکومت نے منظور کی ہے اس سے صاف طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حکومت دیسی زبان کی ترقی کی خواہاں ہے۔ چناں چہ اس قرارداد کی رُو سے نہایت دشوار تجریدی مضمونوں میں بھی ہندستانی زبان میں امتحان لینے کی اجازت دی گئی ہے اب ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ انگریزی کی اعانت کے بغیر ہم اپنی زبان کو مالا مال کر دیں۔ دراصل انگریزی اور ہندستانی زبان میں دُور کی بھی کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ انگریزی کی اعانت سے ہندستانی کو فروغ دیا جائے۔ ہندستانی زبان کو ترقی دینے کے لیے فارسی، عربی اور سنسکرت کے سرچشموں سے فائدہ اُٹھانا سمجھ میں آسکتا ہے۔[۱] اگر انگریزی الفاظ بلا امتیاز ہندستانی میں داخل ہونے چلے گئے تو اندیشہ ہے کہ کہیں ہندستانی زبان بالکل خراب نہ ہو جائے۔ لیکن اگر فارسی، عربی اور سنسکرت سے ہندستانی زبان فائدہ اٹھائے گی تو اصطلاحات بنانے میں سہولت ہو گی اور زبان کو حقیقی معنوں میں فروغ حاصل ہو گا جس کی خواہش حکومت کو ہے۔ میں نے اوپر جن دشواریوں کا ذکر کیا ہے ان کی مثالیں ہمیں ضابطۂ فوج داری و دیوانی کی تدوین میں مل سکتی ہیں۔ ان قانونی کتب کو سمجھنے کے لیے ہر فقرے کو دس مرتبہ پڑھنا چاہیے

---

[۱] بالکل اسی طرح جیسے فرانسیسی زبان لاطینی اور یونانی سے اعانت حاصل کرتی ہے جو اس کی ساخت میں شامل سمجھنی چاہییں۔

تب جاکر اس کا مطلب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کتب کی تدوین میں انگریزی فقروں کا ہو بہو چربہ اُتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی زبان کو ہم خالص ہندستانی نہیں کہہ سکتے۔"

"اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ" کے نامہ نگار نے جن دشواریوں کا اوپر ذکر کیا ہے ہم ان سے انکار نہیں کرتے۔ لیکن "علی گڑھ اخبار" (علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) میں ایک مضمون نگار نے (جن کے متعلق مجھے پوری طرح یقین ہے کہ وہ سید احمد خاں ہیں) اس بات کی حمایت کی ہے کہ ہندستانی میں انگریزی الفاظ کو رواج دینا چاہیے۔ چناں چہ موصوف نے اس زبان کی تائید کی ہے جو آج کل ہندستانی اخبارات میں عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ ہم ذیل میں اس مضمون کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو اخبار کے سات کالموں میں چھپا ہے:-

مضمون نگار نے پہلے بتایا ہے کہ اس کو "المورہ اخبار" میں ایک مضمون پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندستانی زبان کے اخباروں کے طرزِ بیان کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ اس مضمون میں یہ ضرورت بتائی گئی ہے کہ اخباروں کی زبان ایسی صاف اور سادہ ہونی چاہیے کہ ہر بڑا چھوٹا آسانی سے اسے سمجھ سکے اور جو مطالب بیان کیے گئے ہوں وہ ایسے متعین ہونے چاہییں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں ان کے متعلق شبہے کی گنجایش باقی نہ رہے لیکن عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اخبار نویس حضرات نہ تو اپنے طرزِ تحریر کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور نہ انھیں اس کی فکر ہوتی ہے کہ اخبار بیں طبقے کی سہولت کیا ہے۔ "المورہ اخبار" کے دوسرے مضمون کا بھی

حوالہ دیا گیا ہے جس میں دیسی اُردو اور اس اُردو کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے جو انگریزی کے اثر سے بن رہی ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ہند اپنی قومی زبان کو اس کی اصلی حالت میں برقرار رکھنے کے خواہاں ہیں۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ زبان اصلی حالت میں برقرار کیوں کر رہے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ یہ زبان مالا مال ہو اور اس میں مطالب ادا کرنے کی صلاحیت بڑھے۔ ہمارے زمانے سے کچھ قبل اُردو کی خاص حیثیت تھی۔ نظم و نثر میں اس زبان میں ایسی تصانیف موجود ہیں جو نہایت دل چسپ ہیں اور جن کی شہرت آج تک ہے۔ لیکن ان پرانی کتابوں کا طرزِ بیان اس سے مختلف ہے جو آج کل پایا جاتا ہے۔ موجودہ طرزِ بیان قابلِ ترجیح ہے اس واسطے کہ اس میں ایک طرح کا لطف اور صفائی پائی جاتی ہے جو اس زبان کے شایانِ شان ہے جو ایک بڑے ملک کی قومی زبان ہے۔ کچھ عرصے قبل عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اُردو میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے کہ وہ ملکی ضروریات کی کفیل ہو سکے لیکن آہستہ آہستہ اس میں ایسی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ اس قدر مالا مال ہو گیا ہے کہ اب ہم اس کو ہندستان کی قومی زبان کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے ہر قسم کے خیالات ادا کیے جا سکتے ہیں اور اس سے تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ اب وہ زمانہ گیا جب کہ ہم اپنے خطوط اور ابتدائی کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھا کرتے تھے اور اس طرح ایک غیر زبان کے ذریعے ہمیں علم و ادب تک رسائی حاصل ہوا کرتی تھی۔ اُس وقت اُردو زبان میں اتنی پختگی نہیں آئی تھی کہ وہ ہر قسم کے

مطالب ادا کر سکتی، لیکن اب اس زبان کے ذریعے سے ہر قسم کے مطالب ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اس زبان میں نظم اور شاعرانہ نثر کے علاوہ تاریخ و قصص کے بیان کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہو۔ اس کے سوا قدیم و جدید علوم، فنی مضامین اور حکومت کے احکام سب نہایت اچھی تُلی زبان میں صحت و صفائی کے ساتھ ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اس زبان میں جو اخبارات نکلتے ہیں ان کی کافی اشاعت ہو۔ غرض کہ زبان سے جو ضروریات پوری ہوتی ہیں وہ سب بہ درجۂ اتم اس زبان سے پوری ہوتی ہیں۔

مضمون نگار محمد ارشاد کا خیال ہو کہ اخباروں اور حکومت کے قوانین کے ترجمے میں جو ہندستانی زبان استعمال کی جاتی ہو وہ ایک طرح کی انگریزی ہندستانی ہو۔ مضمون نگار کا یہ خیال دُرست معلوم ہوتا ہو اس لیے کہ اس زبان میں انگریزی کے الفاظ اور محاوروں کی بہتات ہوتی ہو۔ اخباروں میں جو زبان لکھی جاتی ہو اس میں عربی اور فارسی کے لفظ بھی بہ کثرت استعمال ہوتے ہیں لیکن ان اخباروں کے مضمون نگاروں کی عربی اور فارسی کی واقفیت بہت محدود ہو۔ ہندستانی زبان میں انگریزی لفظوں کے استعمال کی حمایت "علی گڑھ اخبار" میں کی گئی ہو اور یہ ثابت کیا گیا ہو کہ انگریزی لفظوں کا استعمال ہندستانی کی ترقی کے لیے ضروری ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ انگریزی محاوروں کو ہندستانی میں رائج کیا جائے جس کی وجہ سے ہندستانی زبان کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ "علی گڑھ اخبار" کے مضمون نگار کا خیال ہو کہ اُردو ایک مرکب

زبان ہے۔ اس میں مختلف عناصر شامل ہیں۔ اگر اس میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کر دیا جائے تو کچھ مضائقے کی بات نہیں۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "جس زمانے میں ہندستانی زبان نئی نئی وجود میں آئی اس وقت اگر انگریزی، فارسی کی جگہ سرکاری زبان ہوتی تو نئی زبان میں یقیناً بجائے فارسی الفاظ کے انگریزی کے لفظوں کی بھرمار ہوتی۔ اب ہمیں چاہیے کہ جب کبھی کسی مفید انگریزی لفظ سے ہماری ضرورت پوری ہوتی ہو تو اس کو بلاتکلف اپنی زبان میں داخل کرلیں۔ ایسا کرنے سے ہماری زبان میں سُقم پیدا ہونے کے بجائے دل کشی پیدا ہوگی۔ اگر بجائے پانچ زبانوں کا مرکب ہونے کے ہماری زبان چھو کا مرکب ہوجائے گی تو کوئی بڑا فرق نہیں پیدا ہوگا۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ غیرضروری طور پر انگریزی الفاظ رائج کریں۔ ہم صرف انھی الفاظ کو لینا چاہتے ہیں جو ضروری ہیں اس قسم کے الفاظ میں ہم "پارلی منٹ" "کمیٹی" اور "سوسائٹی" کو خیال کر سکتے ہیں۔ اس طرح کے بہت سے دوسرے لفظ ہیں جن کا ہماری زبان میں داخل کرنا ضروری ہے۔ شاعری، مذہب اور خانگی بول چال میں اس قسم کے الفاظ داخل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی بیٹی کو "مائی ڈاٹر" یا "مائی ڈیر" نہیں کہیں گے۔

اب میں ذیل میں ان کتابوں کا ذکر کروں گا جو حال میں شایع ہوئی ہیں:-

مجموعۂ سخن۔ یہ اُردو کے شاعروں کا تذکرہ ہے جسے پنڈت شیو نراین نے مرتب کیا ہے اور لکھنؤ سے شایع کیا ہے۔ پنڈت جی اپنی متعدد تصانیف کی بدولت شہرت رکھتے ہیں۔

مجمع الاشعار۔ یہ بھی اُردو شاعری کا تذکرہ ہے اور دہلی سے شایع ہوا ہے

یہ دونوں تذکرے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ باوجود بعض ہندوؤں کی رجعت پسندی کے اُردو شاعری کا ذوق ہندستان میں اب تک نشوونما پا رہا ہے۔ اس کا اظہار ان دیوانوں کے دیکھنے سے بھی ہوتا ہے جو فقیر محمد گویاؔ لکھنوی اور زمان علی نے شایع کیے ہیں۔[۵] "زیبا فسانہ" میں جو ابھی حال میں شایع ہوا ہے ایک قصہ نظم میں بیان کیا گیا ہے۔

سنہ ۱۸۶۷ء میں 'مرتھا' (اودھ) میں قرآن شریف کا ایک ایڈیشن شایع ہوا ہے۔ اس کے ہر صفحے پر دس سطریں ہیں۔ ہر سطر کے نیچے فارسی اور اُردو میں ترجمہ ہے اور حاشیوں پر جلالین کی تفسیر ہے۔ یہ ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جلالین سے مُراد محلی اور سیوطی کی تفسیر ہے۔ انھیں جلالین اس لیے کہتے ہیں کہ ان دونوں کے نام کے شروع میں 'جلال' آتا ہے۔ فارسی ترجمے کا عنوان "فتح الرحمٰن" ہے۔ یہ ترجمہ ولی اللہ عبدالرحیم نے کیا ہے۔ اس سے قبل بھی قرآن شریف کا ایک ایڈیشن شایع ہو چکا ہے جس میں اُردو ترجمہ موجود ہے اور جلالین کی تفسیر بھی ہے۔ اس ایڈیشن کا پہلا حصہ میرے پاس موجود ہے۔ یہ چھوٹی تقطیع پر ۹۳۹ صفحات میں ہے۔

حال میں اُردو کی جو کتب شایع ہوئی ہیں، ان میں سے میں صرف ان کے متعلق یہاں ذکر کروں گا جن سے میرے مقالے پڑھنے والوں کو کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے۔

---

[۵] یہ غالباً وہی شاعر ہیں جن کے متعلق میں نے اپنی کتاب "ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ" جلد ۳۔ ص ۱۹۱ پر زمان شاہ حافظ رام پوری کے نام سے ذکر کیا ہے۔

تحفۂ تیموریہ۔ یہ کتاب فقہ میں ہی (اخبارِ عالم، مورخہ ۲۰ جون ۱۸۶۲ء)
تاریخ گجرات۔ یہ مرزا اعظم بیگ کی لکھی ہوئی تاریخ ہی جس میں گجرات کا مفصل حال ملتا ہی[1]۔
سراج الہدایت۔ مصنفہ وزیر علی خاں[2] اس کتاب میں عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے متعلق مفصل بحث کی گئی ہی۔
سیرِ ستانِ انگلینڈ۔ یہ کرشن داس کا سفرنامۂ انگلستان ہی۔ انھوں نے اس کتاب میں ان خیالات کو ظاہر کیا ہی جو ان کے انگلستان میں قیام کی وجہ سے پیدا ہوئے[3]۔ اس ضمن میں مسٹر ٹی۔ ڈی فورستھ Forsyth کے سفرنامۂ ترکستان کا ذکر کردوں۔ یہ سفرنامہ اہلِ ہند نے بہت پسند کیا اور اس کا اُردو میں لاہور سے ترجمہ شایع ہوچکا ہی۔
راحت السالکین۔ یہ غلام محمد کی غزلوں کا مجموعہ ہی جو سیالکوٹ سے شایع ہوا ہی۔ غزلیں تصوفانہ رنگ میں ہیں۔
نامۂ منتظر۔ یہ شیو ناتھ کی غزلوں کا مجموعہ ہی جو لاہور سے شایع ہوا ہی۔ غزلیں عاشقانہ رنگ میں ہیں۔

---

[1] صفحات ۶۰۲۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۰ء

[2] نذیر نے اپنی کتاب 'ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ' میں وزیر علی کا ذکر کیا ہی۔ غالباً یہ وہی وزیر علی ہیں (جلد ۳-۲۹۴)

[3] صفحات ۱۸۸ مطبوعہ دہلی ۱۸۶۱ء

منشی نظام الدین نے فارسی کی مشہور کتاب "اخلاقِ ناصری" کا، جس میں اصولِ اخلاق سے بحث کی گئی ہی، اُردو میں ترجمہ کیا ہی۔ یہ ترجمہ لاہور سے شایع ہوا ہی اور ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہی۔ اسی قسم کی دو اور کتابیں منشی غلام سرور نے لاہور سے شایع کی ہیں۔ ایک کا نام "اخلاقِ سرور" ہی اور دوسری کا "مخزنِ حکمت"۔

ہندستانی میں کارآمد کتابیں تالیف کرانے کی ہر طرف ہمت افزائی کی جا رہی ہی۔ مسلمانوں کی ترقیٔ تعلیم کے لیے جو انجمن قائم ہی اس نے فیصلہ کیا ہی کہ ہندستانی زبان میں لکھنے والے مصنفین کو پان سو، تین سو اور سو رُپے کی رقمیں ان کی کتابوں کے معیار کے لحاظ سے بہ طور معاوضہ دی جائیں۔

گورنر جنرل لارڈ میئو نے، جن کی ناگہانی موت سے سارے ہندستان میں ہل چل مچ گئی ہی، اہلِ ہند کی بھلائی کے لیے فیصلہ کیا تھا کہ ایک ہزار رُپے کی رقم بہ طورِ انعام کے اس شخص کو دی جائے جو مختلف امراض کے علاج کے متعلق بہترین کتاب تالیف کرے۔ جو اشخاص اس مقابلے میں شریک ہونا چاہیں وہ اپنے مسودات ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۲ء سے پہلے محکمۂ طبابتِ کلکتہ کو بھیج دیں۔

ان مشرقی مصنفین کی پوری کتابیں رکھنے کے بجائے جن کی تصانیف کے بعض حصے مدارس اور کالجوں کے نصاب میں داخل ہیں یہ فیصلہ کیا گیا ہی کہ ان کی کتب کے اقتباسات نصاب میں شامل کیے جائیں۔ مسٹر جان مردوش کی بھی یہی رائے ہی۔ اس کا بھی اہتمام کیا جائے گا کہ ایسے اقتباسات نہ رکھے جائیں جن سے مسیحی خیالات کی نشر و اشاعت مقصود ہو۔ ہمارے خیال میں یہ غیر ضروری تھا۔

حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ جو لوگ ہندستانی زبان میں (اردو میں یا ہندی میں) فلسفہ، تاریخ، سیاحت یا سائنس پر کوئی کتاب تالیف کریں گے. انھیں ان کی محنت کا معاوضہ دیا جائے گا بشرطے کہ کتاب کا طرزِ بیان دل کش اور عام فہم ہو۔ اس کی بھی اجازت ہوگی کہ کتاب نظم میں لکھی جائے یا نثر میں۔ اگر کوئی چاہے تو ایسے موضوع پر قلم اُٹھائے جو بالکل خیالی ہو بشرطے کہ اس میں کوئی بات ایسی نہ آنے پائے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے گری ہوئی ہو۔ سنہ ۱۸۷۱ء اور سنہ ۱۸۷۲ء میں ہندی اور اُردو کی ۲۲ کتابیں کمیشن نے پسند کیں جو خاص اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ان کتابوں کے مصنفین کو ۸ مئی سنہ ۱۸۷۲ء الہ آباد میں لفٹنٹ گورنر نے انعامات تقسیم کیے۔ بعض نے رقمی معاوضہ قبول کیا اور بعض نے اپنی کتاب حکومت کے خرچ پر طبع کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ بعض کتابوں کے نسخوں کی ایک خاص تعداد حکومت کے مدارس کے لیے خریدنے کی منظوری دی گئی۔ ان کتابوں اور ان کے لکھنے والوں کی فہرست دینا غیر ضروری ہوگا۔ میں یہاں صرف ان میں سے چند کی نسبت ذکر کر دوں گا۔ ”تاریخِ آگرہ“ کے مصنف کریم الدین ہیں۔ ”جغرافیۂ راج پوتانہ“ پنڈت کرشنا نند کی تصنیف ہے جو بریلی کے رہنے والے ہیں۔ پنڈت منولال نے ضلع مراد آباد کا جغرافیہ لکھا ہے مرزاپور کے پنڈت گدادھر نے ایک سنسکرت کے ناٹک کا ترجمہ کیا ہے۔ اس ضمن میں منشی ذکاء اللہ کے ”سلسلۂ العلوم“ کا ذکر کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ منشی ذکاءُ اللہ دہلی کے نارمل اسکول کے مدرس ہیں

مسٹر کمپسن، ناظمِ تعلیماتِ صوبہ جاتِ شمال مغربی نے "سلسلۃ العلوم" کی بہت تعریف کی ہے۔[1]

ہندستانی زبان کی ۱۴ ہزار جلدیں ۱۸۷۱ء میں حکومتِ بمبئی کی طرف سے مدارس وغیرہ کو تقسیم کی گئیں۔ ان میں بعض کو حکومت نے اپنے خرچ سے طبع کرایا تھا اور بعض کو مصنفین سے خریدا تھا۔[2] میرا خیال ہے کہ غالباً ۱۸۷۲ء میں بھی حکومتِ بمبئی نے تقریباً اتنی ہی جلدیں خریدیں۔ صوبہ بمبئی کے ناظمِ تعلیمات مسٹر پیل نے اعلان کیا ہے کہ اُردو اور سندھی میں جو عمدہ کتابیں تصنیف کی جائیں گی، ان کے لکھنے والوں کو حکومت کی طرف سے انعام دیے جائیں گے۔[3]

اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہندستانی زبان کی متعدد کتابیں ایسی شائع ہو چکی ہیں جن سے اہلِ ہند کی تعلیم میں بہت مدد ملے گی۔ ان میں سے بعض انعام کی مستحق قرار پائیں۔ علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے تین سال کے عرصے میں بیس کتابیں شائع کی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کتب واقعی مفید ہیں اور جس مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں وہ ان سے پورا ہوتا ہے

[1] اتالیق پنجاب۔ اگست ۱۸۷۲ء، علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۲ اگست ۱۸۷۲ء۔
یہ منشی ذکاءاللہ وہی ہیں جنھوں نے شورشِ عظیم سے کچھ پہلے ۱۸۵۶ء میں میرے مضمون "اردو تذکروں پر تقریظ" کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کا ذکر میری کتاب "ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ" میں ہے۔ جلد ۳۔ ص ۳۵۲

[2] رپورٹ سررشتہ تعلیم صوبہ بمبئی بابت ۱۸۷۱ء و ۱۸۷۲ء۔ ص ۳۱

[3] اخبار الاخیار۔ مورخہ یکم جولائی ۱۸۷۲ء

یا نہیں ؟ اس مسئلے پر مسٹر لازرس (LAZARUS) نے میرٹھ کی مجلسِ مباحثہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور میرٹھ کے "لارنس گزٹ" مورخہ ۱۴ر جون میں ان کی یہ تقریر شایع ہوتی ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ اِن میں سے اکثر کتب نہایت مفید ہیں اور جن کتابوں کا حکومت کی طرف سے معاوضہ دیا گیا ہے وہ درحقیقت اسی لائق تھیں۔

"علی گڑھ اخبار" مورخہ ۲۸ر جون میں اس تقریر کا جواب شایع ہوا ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندستانی کی اکثر کتب جو شایع ہوئی ہیں، کچھ مفید نہیں ہیں اور ان کتابوں میں بھی جن کا معاوضہ دیا گیا ہے کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ ان کتابوں میں زیادہ تر اخلاقیات کے مسائل ہیں اور لفظوں کو ادل بدل کر وہی مطالب بیان کیے گئے ہیں جو دوسری کتابوں میں ملتے ہیں۔ مضمون نگار نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر ہر کتاب میں علم یا فن کے کسی ایک موضوع پر بحث کی جائے اور اس کے متعلق تحقیق ہو تو زیادہ مفید ہوگا۔ اب حال یہ ہے کہ سب کتابیں موضوع کے اعتبار سے آپس میں ایک دوسرے سے ملتی جُلتی ہیں اور ان کے پڑھنے سے علم میں مطلق اضافہ نہیں ہوتا۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں کہ مصنفین کو ان کی محنت کا معاوضہ دیا جائے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی تصانیف کی جانچ سختی کے ساتھ ہونی چاہیے اور صرف وہی قابلِ ترجیح قرار پائیں جن کی زبان صاف اور پاکیزہ ہو جیسی کہ دہلی کے مصنفوں کی ہوتی ہے۔ مضمون نگار نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع پر بھی بحث کی ہے۔ مضمون نگار کو اس بات

کا یقین ہے کہ ہندستانی زبان میں نصاب کی جو کتب لکھی جا رہی ہیں، ان میں آہستہ آہستہ ترقی ہوگی اور کچھ عرصے بعد بہتر کتابیں لکھی جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہ تدریج ہی ہو سکتا ہے۔ جوں جوں ہندستانی لکھنے والوں کو نصابی ضروریات کے مدِ نظر لکھنے کی مشق ہوتی جائے گی، اسی قدر جلد عمدہ قسم کی کتابیں فراہم ہو سکیں گی۔

۴ اگست کے "لارنس گزٹ" میں مسٹر لازرس نے "علی گڑھ اخبار" کے متذکرہ بالا مضمون کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس جواب کا جواب "علی گڑھ اخبار" کے مدیر نے ۱۶ اگست کی اشاعت میں دیا ہے اور اپنے دلائل کو بہ وضاحت بیان کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جو تصانیف معاوضے کے لیے مقابلے میں پیش کی جائیں گی ان کا جانچنا بہت دشوار کام ہے۔ ان تصانیف کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ مرکزی کمیٹی جو الہ آباد میں ان کے جانچنے کے لیے منعقد ہوتی ہے، وہ ان سب تصانیف کو نہیں پڑھ سکتی۔ کمیٹی زیادہ تر انفرادی آرا پر بھروسا کرتی ہے لیکن کوئی شخص ایسا نہیں ہوتا جس نے سب تصانیف پڑھی ہوں۔ اس لیے زیادہ تر قیاس اور اٹکل سے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ "علی گڑھ اخبار" نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ ان مصنفین کی مطلق ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے جو اِدھر اُدھر سے سرقہ کر کے محض معاوضے کی خاطر کتاب تیار کر لیتے ہیں۔ وہ دوسری کتابوں کی زبان میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے وہی مطالب اپنی کتاب میں شامل کر لیتے ہیں۔ "تحفۃ العروس" کو بہ طورِ مثال پیش کیا گیا ہے جو تمام تر "مرآت العروس" پر مبنی ہے۔[1]

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب "ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ" جلد ۲ ص ۴۰۶ (دوسرا ایڈیشن)

سوائے زبان کے دونوں کتابوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ مسٹر جان بیمز Beames نے 'چند' کے متعلق اپنی تحقیقات جاری رکھی ہے۔ موصوف نے اس کے متعلق اس سال کے "جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال" میں ایک مضمون شایع کیا ہے جس کے ساتھ اصل متن کا بھی کچھ حصہ ہے۔ "انڈین انٹی کویری" میں مسٹر بیمز نے اپنے ایک مضمون میں بتایا ہے کہ ہندی کی بولیوں کو لسانیاتی نقطہ نظر سے خاص اہمیت حاصل ہے[1]۔ جس طرح مسٹر ایچ۔ ایچ ولسن نے ادب کی اہمیت واضح کی ہے اسی طرح مسٹر بیمز نے بولیوں کے متعلق یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی لسانیاتی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ موصوف سے قبل ریورنڈ ایس۔ ایچ کیلوگ Kellogg نے یہی خیال پیش کیا تھا اور یہ بات واضح کی تھی کہ اگرچہ ان بولیوں کا سنسکرت سے تعلق ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ میں بھی یہی خیال مدت ہوئی ظاہر کر چکا ہوں۔ ریورنڈ ڈاکٹر اے۔ ایف آر ہورنل جو بنارس کے جگ نراین کالج میں ہیں، 'چند' کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں۔ چوں کہ اب مسٹر گروس نے جو 'چند' کے متعلق کام کر رہے تھے، اس کام کو تقریباً ترک کر دیا ہے اس لیے ریورنڈ اے۔ ایف۔ آر ہورنل نے مسٹر بیمز کے ساتھ کام کرنا

[1] مسٹر بیمز نے اس موضوع پر ایک اور مضمون لکھا ہے جو "ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی کارروائیوں میں شایع ہوا ہے۔ مضمون کا عنوان "گمبھیر رائے کی رزمیہ نظم" ہے (اگست ۱۸۷۶ء)

شروع کر دیا ہے۔

والمیکی کی رامائن کی جو نقلیں کی گئی ہیں یا ہندستان کی جدید زبانوں میں اسی قسم کی جو نظمیں لکھی گئی ہیں، ان کے متعلق ایک عقیدت مند ہندو نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں صرف تلسی داس کی رامائن ایک ایسی ہے جس میں انسانی نکوکاری کو اجاگر کرکے دکھایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدت مند ہندو اس کو بڑے اعتقاد سے پڑھتے ہیں۔ شمال مغربی ہند میں ہر ہندو چاہے وہ پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ ہو تلسی داس کی رامائن کے چند اشعار اسے ضرور یاد ہوتے ہیں جنھیں وہ مناسب موقع محل پر پڑھ دیتا ہے۔[۱]

یجر وید کی برج بھاشا کی تفسیر جسے گوری پرشاد سنگھ راجا بیما، نے کچھ عرصہ ہوا لکھنا شروع کیا تھا۔ اب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ اس کے تین حصے شایع ہو چکے ہیں جو دیوناگری رسمِ خط میں ۶۰۰ صفحات پر آئے ہیں۔

سنسکرت کی کتاب راماسوامیدھ کا ہندی ترجمہ دوسبے اور چوپائی میں کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق "کبی بچن سدھا" مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۸۷۱ء میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ہندوؤں کی زبان کی رجعت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ دہلی میں "مجنوں لیلیٰ" کے عربی قصے کو ہندی میں شایع کیا گیا ہے۔

آگرہ میں مہابھارت کا اُردو ترجمہ ماہ وار برابر شایع ہو رہا ہے اور پنجاب کی "انجمنِ ادب" نے بھی اس کا نسخہ خریدا ہے۔[۲]

---

[۱] علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۸۷۱ء [۲] اخبار انجمنِ پنجاب مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۱ء

یہ بات تعجب سے سُنی جائے گی کہ دہلی کی "مجلسِ ادب" کی جانب سے رگ وید کا اُردو ترجمہ کرایا گیا ہے اور اس وقت زیرِ طباعت ہے۔ لیکن یہ ترجمہ بجائے اصل سنسکرت کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے۔ ترجمہ کرنے والے لکشمن داس ہیں اور پنڈت بشن ناتھ نے بھی ان کے ساتھ اس کام میں شرکت کی ہے۔

بمبئی کے ناظمِ تعلیمات مسٹر پیل Mr. Peile نے ازراہِ نوازش جدید کتابوں کی فہرست بھیجی ہے جس سے ہندستانی، سندھی، مرہٹی اور گجراتی کی کتابوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں "کامروپ" اور "برہ بارہ ماسا" قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ فلسفۂ ویدانت پر ہندی زبان میں ایک تفسیر ہے جن میں سنسکرت اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام "ودیان نو کا سانک" ہے۔ اس کے مصنف کا نام شام داس ہے۔ ہندی سے انگریزی میں جو ترجمے ہوئے ہیں ان میں "راج نیتی" کا ترجمہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ ترجمہ سی ڈبلو بوڈلر C. W. Bowdler نے کیا ہے۔

ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے جو کچھ عرصے سے آدی گرنتھ کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں، ابھی حال میں ایک حصہ بہ طورِ نمونہ "جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی" (جلد ۵۔ حصہ ۲۔ ص ۱۹۷) میں شایع کیا ہے۔ موصوف نے نہایت تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ آدی گرنتھ کی زبان "دسویں پادشاہ کے گرنتھ" کی طرح ہندی نہیں ہے بلکہ اس سے مختلف ہے۔ یہ زبان بڑی حد تک سندھی سے مشابہ کہی جا سکتی ہے جسے ہم قدیم گُرمکھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹرمپ

نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے مثالیں پیش کی ہیں اور اُن پر تنقید کی ہے۔ اس فاضلانہ بحث سے جو نہایت دل چسپ ہے بعض غیر یقینی باتیں پایۂ تصدیق کو پہنچ جاتی ہیں۔ اس ضمن میں موصوف نے مجھے ذاتی طور پر گزشتہ ۲ر اکتوبر کو ایک خط لکھا ہے جو مَیں یہاں نقل کرتا ہوں:-

"مَیں گزشتہ اپریل میں ہندستان سے واپس آچکا ہوں۔ وہاں کے دَورانِ قیام میں مَیں نے سخت محنت کی۔ سِکھ مذہب کے عالموں کی مدد سے مَیں نے لاہور میں پُورے گرنتھ کا مطالعہ کیا، اس سلسلے میں مجھے معلوم ہوا کہ خود ان لوگوں کو اپنی مقدس کتاب کے متعلق بہت کم واقفیت ہے۔ ان کی تاویلیں اکثر بالکل قیاسی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے اِس لیے تعجب نہیں ہوا کہ یہ لوگ سنسکرت نہیں جانتے اور پراکرت سے بالکل ناواقف ہیں جو قدیم ہندی کو سمجھنے کے لیے نہایت ضرُوری ہے۔ جوں جوں مَیں نے آدی گرنتھ کے مطالعے میں ترقی کی اتنا ہی مَیں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مجھے اس زبان کی ایک لغت اور ایک کتاب صرف و نحو کے متعلق تیار کرنی چاہیے۔ لدھیانہ کے امریکی مبلغینِ مسیحیت نے جو پنجابی کی لُغت تیار کرائی ہے اس سے آدی گرنتھ کے سمجھنے میں مطلق مدد نہیں ملتی۔ تھامسن کی ہندی لُغت بھی اس مطلب کے

لیے بے کار ثابت ہوئی۔ غرض کہ میں نے یہ دونوں کام اپنے ذمے لیے اور میں اپنے تئیں مبارک باد دیتا ہوں کہ انھیں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اب مجھے جب کبھی فرصت ملی تو پنجابی گرامر کو شایع کروں گا جو مجھے یقین ہے آپ کے لیے دل چسپی کا موجب ہوگی اس واسطے کہ گرنتھ میں ازمنۂ وسطیٰ کی ہندی بولیوں کا انتخاب ملتا ہے جن سے ہندستان کی موجودہ زبانیں نکلی ہیں۔ ان قدیم بولیوں کے ذریعے بہت سے لسانی مسائل ہماری سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اگرچہ یہ بولیاں آج مُردہ ہیں لیکن ان کی اہمیت باقی ہے۔ آپ اپنی تصنیف "ہندی اور ہندُستانی ادب کی تاریخ" میں گرنتھ کے مصنفین کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ کبیر داس کے کلام کا بیش تر حصّہ گرنتھ میں شامل ہے۔ اس طرح ہندی کے قدیم لکھنے والوں میں نام داس، راوی داس، تریلوچن، بیپا اور سینا وغیرہ اور دوسرے بھگتوں کا کلام آپ کو اس میں ملے گا۔ ان مختلف بھگت شاعروں کی زبان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور ان کی زبان کا سمجھنا بعض اوقات بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک زبان کی شکل میں صحت و تعین نہیں پیدا ہوا تھا۔ ہندستان میں مجھے کبیر کے کلام کا ایک قلمی نسخہ دست یاب ہوا ہے جس کی میں نہایت احتیاط کے ساتھ نقل کروا رہا ہوں۔ قدیم ہندی کے

شاعروں میں دادو، بھونا، ہری چند اور سُندر داس کے
کلام کے نسخے بھی مَیں نے حاصل کر لیے ہیں۔"

اس عرصے میں ان تھک ڈاکٹر ٹرمپ کی "سندھی صرف ونحو"
شائع ہو چکی ہی[1] یہ ایک نہایت اہم کتاب ہی۔ ہمارے لیے اس میں
اس لیے اور زیادہ دل چسپی موجود ہی کہ سندھی زبان کا ہندستانی اور
دوسری دیسی زبانوں سے مقابلہ کیا گیا ہی۔ اس کتاب کی بدولت
ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہی۔ اس کی اشاعت انگریزی حکومت
کی طرف سے کی گئی ہی۔ اس کا انتساب سر بارٹل فریر
Sir Barte Ferer کے نام کیا گیا ہی جو بمبئی کے لفٹنٹ گورنر تھے۔
ڈاکٹر ٹرمپ نے پشتو زبان کی صرف ونحو بھی تیار کی ہی جو زیرِ طباعت
ہی۔ موصوف نے عام خیال کے خلاف یہ بات ثابت کی ہی کہ
پشتو ہندستانی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہی۔

ہندستانی اُردو کی ابتدائی کتابوں کو جو کامیابی اور مقبولیت
حاصل ہو رہی ہی وہ دراصل ایک طرح کا ردِّ عمل ہی ان حملوں کے
خلاف جو مسٹر کمبل نے اس زبان پر کیے تھے۔ اس ضمن میں مسٹر
جان ڈوسن John Dowsen کی اُردو صرف ونحو قابلِ ذکر ہی[2]۔

---

[1] Grammar of the Sindhi Language Compared with the Sanscrit-Pracrit and the cognate-Indian-Vernaculars. (Leipzig. 1872)

[2] A Grammer of the Urdu or Hindustani Language (London 1872)

موصوف سنڈھرسٹ کے اسکول میں اُردُوزبان کے پروفیسر ہیں۔ درحقیقت اُردُوزبان کی صَرف ونحو پر نئی کتاب کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی اس واسطے کہ اس موضوع پر پہلے سے متعدد کتب موجود تھیں لیکن مسٹر جان ڈوسن نے اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے۔ اُردُو صرف ونحو پر اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں مسٹر ڈوسن کی کتاب سب سے زیادہ مکمل ہے۔ اس میں "باغ وبہار" سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ خط شکستہ اور تقویم کے متعلق نئی معلومات درج کی گئی ہیں۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ مسٹر ڈوسن نے بھی شیکسپیر کی طرح اُردُو کے ایرانی، ہندی حروفِ تہجی مکمل نہیں درج کیے بلکہ صرف ان کی علاحدہ علاحدہ اصلی شکلیں لکھی ہیں۔ وہ شکلیں جو دُوسرے حرُوف سے مل کر پیدا ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے بعض اوقات اصلی حرف پہچان نہیں پڑتا، چھوڑ دی گئی ہیں۔ اگرچہ ان کے متعلق علاحدہ ذکر کر دیا گیا ہے۔

دیبی پرشاد رائے نے ایک لغت۔ کلکتہ سے شائع کی ہے جس میں ہندی اور ہندستانی کے علاوہ انگریزی، فارسی اور بنگالی کے الفاظ ہیں۔ اس کے علاوہ ہندستانی زبان کی اور متعدد کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جن کا ذکر غیر ضرُوری ہے۔ الہ آباد کے ریورنڈ جے ڈی بیٹ کی ہندی لغت آج کل زیرِ طباعت ہے۔ اس لغت میں ۴۷ ہزار الفاظ ہیں۔ شیکسپیر، فوربس اور تھامسن کی لغتوں کے مقابلے میں اس میں بارہ ہزار الفاظ زیادہ ہیں۔ یہ لغت تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگی۔ اس وقت اس کا نمونہ میرے پیشِ نظر ہے۔ ڈاکٹر ایس ڈیو فیلن

کی ہندستانی انگریزی لغت کا نمونہ بھی میرے سامنے ہے۔ یہ لغت اور دوسری لغتوں کے بہ نسبت جواب تک شائع ہوئی ہیں، زیادہ مکمل ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ عورتوں کی زبان کے خاص الفاظ اس میں شامل کیے گئے ہیں جو اور دوسری لغتوں میں نہیں ملتے۔

ڈاکٹر جی۔ڈبلو لیٹنر کی علمی کاوشیں ابھی جاری ہیں۔ موصوف نے ہندستانی میں عربی زبان کی گرامر لکھی ہے جس کا نام "مقدمۃ الصرف" ہے۔ یہ کتاب ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور لاہور میں طبع ہوئی ہے۔

میجر ہنری کورٹ نے جنھوں نے کچھ عرصہ قبل 'سودا' کا کلیات شائع کیا تھا، "نثرِ بے نظیر" کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۲ء میں الہ آباد میں شائع ہوا ہے۔ میں ذاتی طور پر خود میر حسن کی نظم کو ترجمے پر ترجیح دیتا ہوں۔ 'افسوس' کی "آرایشِ محفل" کا بھی انگریزی میں موصوف نے ترجمہ کیا ہے۔

پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کی رپوٹ بابت حالاتِ سرحد شمال مغربی کا اُردو ترجمہ کپتان ہول رائڈ نے کیا ہے جو اصل رپوٹ کے شائع ہونے کے ساتھ لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور اس کے ساتھ ایک نقشہ بھی ہے۔

اُردو زبان میں جو مسیحی ادب شائع ہو رہا ہے اس میں اس سال نئی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ لاہور کے ریورنڈ رابرٹ کلارک کی نوازش سے مجھے ان میں سے چند کتابیں حاصل ہوگئیں اور بعض کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔ ان کتابوں میں مندرجۂ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

تاریخِ محمد۔ یہ کتاب اُردو میں امرت سر کے عماد الدین نے لکھی ہے۔ موصوف مشہورِ عالم ہیں اور مسلمان سے عیسائی ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے ۱۸۷۰ء کے مقالے میں غلطی سے لکھ دیا تھا کہ عماد الدین "اعجازِ قرآن" کے مصنف ہیں، حالاں کہ اس کتاب کے مصنف رام چندر ہیں جو دہلی کے باشندے ہیں اور آج کل پٹیالہ میں ناظمِ تعلیمات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ایسے شخص نے جو کبھی زمرۂ اسلام میں داخل تھا لیکن اب اس سے باہر ہے، اپنی زبان میں لکھی ہے۔ سیرت نگار نے ان متضاد بیانوں کا ذکر کیا ہے جو قرآن اور حدیث میں ملتے ہیں۔ قرآن میں معجزوں کو بے کار بتایا ہے اس لیے کہ ان سے حقیقت ثابت نہیں ہو سکتی۔ حالاں کہ حدیث میں جو بہ ذریعۂ روایات محفوظ ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب ایسے معجزے منسوب کیے گئے ہیں جو مضحکہ خیز ہے۔

عماد الدین ایک اور دوسری کتاب "تعلیمِ محمد" کے نام سے لکھ رہے ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں بہترین دیسی ماخذ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ہندستان کے مسیحی ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تبلیغ و اشاعت کے کام میں ان دونوں کتابوں سے بہت مدد ملے گی۔

نغمۂ زنبوری۔ اس میں عماد الدین اور لکھنؤ کے ایک مولوی کا مباحثہ بیان کیا گیا ہے۔

تحقیق الایمان۔ اس کتاب میں عمادالدین نے مختلف مذاہب کے
متعلق تحقیق کی ہے۔

۲ ضرورتِ ہند۔ یہ سردار دھیان سنگھ کا خطبہ ہے جو انھوں نے سکھ
سرداروں کے رُوبہ رُو پڑھا تھا تاکہ وہ غلط راستے
کو چھوڑ کر سیدھا راستہ اختیار کریں اور وحشت و
بربریت کو ترک کرکے تہذیب و تمدن کے سایے
میں پناہ لیں۔ یہ خطبہ امرت سر میں جو سکھوں کا
مذہبی مرکز اور تجارت کی بڑی منڈی ہے، طبع ہوا۔

ایک ہندستانی شخص نے جو عیسائی ہوگیا ہے ایک سو صفحوں
کا رسالہ لکھا ہے جو الہ آباد میں طبع ہوا ہے[1] اس رسالے کا نام
"مرآت الواعظین" ہے۔ اس میں ان لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے جو
دیسی لوگوں میں مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔
مضمون نگار نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا ہے کہ مسیحی مذہب نے
ابتدائی تین صدیوں میں نہ صرف رومۃ الکبرا بلکہ ایران اور عربی
ممالک میں جو ترقی کی اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے
ملے گی۔ یہ ترقی ان حالات میں ہوئی جب کہ مسیحی مبلغوں کو قدم قدم
پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو طرح طرح کی تکلیفیں
پہنچائی جاتی تھیں۔ ہندستان میں مسیحی مبلغوں کو ہر قسم کی سہولتیں
حاصل ہیں اور ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے تب بھی
مسیحیت کی ترقی کو اس ملک میں زور حاصل نہیں ہوا۔ مضمون نگار

[1] اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۸۷۱ء

کا خیال ہو کہ اس کی ذمّے داری دراصل ان دیسی عیسائیوں پر عائد ہوتی ہی جو تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ اوّل تو یہ لوگ جیسے تعلیم یافتہ ہونے چاہییں ویسے نہیں ہیں۔ پھر غلطی سے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کوتاہی کو اپنے جوش و خروش سے پورا کر سکیں گے لیکن حقیقت میں ان کا یہ جوش جھوٹا جوش ہی اس کی تہ میں سچّا مذہبی احساس نہیں ہی اور نہ اس کے پیشِ نظر الوہی مقاصد ہیں۔ یہ لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں کہ یورپین طرز کا لباس پہن کر اور یورپین معاشرت کی تقلید کر کے وہ اپنے کام کے لیے کوئی خاص اثر پیدا کرتے ہیں۔ دراصل ان باتوں کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہی۔ ان باتوں سے اہلِ ہند کے دلوں میں ناراضی پیدا ہوتی ہی۔ وہ انھیں حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ لوگ رُپے پیسے کے لیے تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ مضمون نگار نے اپنی صاف اور کھری باتوں کی معذرت کی ہی اور اپنے مضمون کو سینٹ پال کے اِس مقولے پر ختم کیا ہی کہ "کیا میں اس لیے تمھارا دشمن ہو گیا کہ میں نے تم سے سچّی اور کھری باتیں کہ دیں۔"

میں ان سب کتابوں کا ذکر غیر ضروری سمجھتا ہوں جو مذہبی مسائل کے متعلق یورپین لوگوں نے ہندستانی زبان میں لکھی ہیں اور جو گزشتہ سال شایع ہوئی ہیں۔

ادبی کتابوں کے بعد اخباروں کو خاص اہمیت حاصل ہی جنھیں دن بہ دن ہندستان میں ترقی حاصل ہو رہی ہی۔ وہ سیاسی، علمی اور ادبی اخبار جن کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں بدستور

جاری ہیں۔ ان میں سے بعض مجھے وصول ہوتے ہیں جن کے بھیجنے والوں کا میں شکر گزار ہوں۔ مجھے پہلی مرتبہ "پنجابی اخبار" کے نسخے وصول ہوئے ہیں جو کئی سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

اس وقت ہندستانی زبان کے ۶۰ مختلف اخبارات ہندستان کے چار صوبوں یعنی پنجاب، صوبہ جاتِ شمال مغربی، اودھ اور صوبہ جاتِ متوسط سے شایع ہو رہے ہیں۔[1] صوبہ جاتِ شمال مغربی (یو۔پی) کے ہندستانی اخبارات کی تعداد ۱۸۶۹ء میں ۲۶ تھی، ۱۸۷۰ء میں ۳۳ تھی اور اب اس سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ ان ۳۳ اخباروں میں سے ۲۰ اخبار ہندستانی اُردو میں تھے، ۶ ہندی میں اور ۵ ہندی اور اُردو دونوں میں تھے۔ ایک اخبار بنگالی کا تھا۔ ان اخباروں کے اکثر مضامین انگریزی اخباروں سے ماخوذ ہوتے ہیں لیکن بعض مضامین اصلی ہوتے ہیں اور خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان میں تعلیمی اور معاشرتی مسائل کے متعلق مفید معلومات ہوتی ہیں۔ ان میں وہ شکایتیں صاف صاف بیان کر دی جاتی ہیں جو اہلِ ملک کو انگریزی حکومت سے ہوتی ہیں۔ ان تمام اخباروں میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اپنے مضامین کے معیار کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس اخبار میں مولوی سید احمد خاں اور ان کے تنقید نگاروں میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا یورپین اداروں کو ہندستانی اداروں پر فوقیت حاصل ہے یا نہیں۔ ۱۸۷۰ء میں صوبہ شمال مغربی میں ۸ رسالے شایع ہو رہے تھے جن میں

---

[1] "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۸ نومبر ۱۸۷۲ء

سے ۶ ہندستانی میں، ایک سنسکرت میں اور ایک انگریزی میں ہی۔

اس کے سوا ہندستان کی مختلف ادبی انجمنیں اپنے رسالے شایع کرتی ہیں جن میں ان کی کارروائیاں درج ہوتی ہیں اور ان کے جلسوں میں جو مباحثے ہوتے ہیں ان کا حال درج ہوتا ہی تاکہ رسالے کے پڑھنے والوں کو پوری کیفیت ملتی رہے[1]۔

دہلی کی ادبی انجمن کا اب تک کوئی رسالہ شایع نہیں ہوتا تھا لیکن اب انجمن نے فیصلہ کیا ہی کہ وہ بھی اپنا رسالہ شایع کرے گی۔ چناں چہ اس کی پہلی اشاعت کے متعلق "اتالیقِ پنجاب" میں ذکر ہی اور اس کی بہت کچھ تعریف توصیف کی گئی ہی۔

اور دوسرے رسالے جن کی نسبت میں نے پہلے ذکر نہیں کیا، مندرجۂ ذیل ہیں:-

بودھا سماچار۔ اس ہندی اخبار کا "اخبار انجمن پنجاب"، مورخہ ۱۶ر فروری ۱۸۷۲ء میں ذکر موجود ہی۔

چشمۂ علم۔ یہ اخبار پٹنہ کے نارمل اسکول کی طرف سے نکلتا ہی۔

کوہِ طور۔ - یہ مہینے میں دو دفعہ لاہور سے شایع ہوتا ہی۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۶ر اپریل ۱۸۷۲ء کو شایع ہوئی۔ یہ ۸ صفحوں پر مشتمل ہوتا ہی اور اس میں علمی اور ادبی مضمون ہوتے ہیں۔

---

[1] Report on the Administration of the North West Provinces for 1870-71.

منشورِ محمدی۔ یہ اگست ۱۸۷۲ء سے ہر دسویں روز بنگلور سے شایع ہوتا ہی اور آٹھ صفحوں پر مشتمل ہوتا ہی۔ اس کے مدیر منشی محمد قاسم ہیں جو "قاسم الاخبار" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ اس اخبار کے ضمیمے میں ان مضامین کی تردید شایع کی جاتی ہی جو لکھنؤ کے مسیحی مبلّغوں کے اخبار "شمس الاخبار" میں نکلتے ہیں۔[1]

مطلعِ انوار۔ یہ اخبار اُردُو اور ناگری رسمِ خط دونوں میں ہوتا ہی۔ لاہور سے شایع ہوتا ہی اور اس کے مضامین زیادہ تر ہندوؤں سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہی کہ ہندوؤں کے رسم و رواج اور ان کے عقائد کی حمایت کرے۔ "اخبار انجمنِ پنجاب" مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۱ء میں اس کے متعلق ذکر ہی۔

میو میموریل گزٹ۔ اگرچہ اس کا نام انگریزی وضع کا ہی لیکن یہ اخبار اُردُو کا ہی اور انجمنِ دہلی کی طرف سے شایع ہوتا ہی۔[2]

پٹیالہ اخبار۔ اس کے متعلق "اخبار الاخیار" مورخہ ۵ اپریل ۱۸۷۲ء میں ذکر ہی۔

رسالہ انجمن بٹالہ۔ یہ رسالہ بٹالہ کی انجمن شایع کرتی ہی اور اس کی

---

[1] دیکھو میری کتاب "ہندوی اور ہندستانی ادبیات کی تاریخ" جلد ۳۔ ص ۲۸۶
[2] Allen's Indian Mail مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۷۲ء

طباعت لاہور میں ہوتی ہے۔

شمشیرِ بہادر۔ یہ اخبار ہندستانی زبان میں نکلتا ہے۔ اس کے متعلق النس انڈین میل Allen's Indisn Mail مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۶۲ء میں ذکر موجود ہے۔

عمدۃ الاخبار۔ یہ اخبار بھوپال سے شایع ہوتا ہے۔ اسی نام کے دو اخبار ایک مدراس سے اور ایک بریلی سے شائع ہوتے ہیں۔

اُردُو گائڈ۔ یہ ہندستانی زبان کا اخبار کلکتہ سے ٹائپ میں شایع ہوتا ہے اور مطبع منظر العجائب میں چھپتا ہے۔ "منظر العجائب" مطبع کا بھی نام ہے اور ایک اخبار کا بھی نام ہے جو اسی مطبع میں چھپتا ہے۔ اس کے مدیر کا نام تریلا کھونا تھ دت ہے۔

دیسی لوگوں کے انگریزی اخبار جو ہندستان میں شائع ہوتے ہیں ان میں علی گڑھ کا "محمڈن سوشل ریفارمر" (تہذیب الاخلاق) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

الہ آباد کے رسالے "مخزنِ مسیحی" کی نسبت میں اپنے ۱۸۶۸ء والے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں۔ یہ رسالہ بدستور جاری ہے۔ اس کے مدیر ریورنڈ جے جے والش Rev. walsh ہیں جو آج کل یورپ آئے ہوئے ہیں۔ موصوف نے مجھے دسمبر ۱۸۷۱ء تک کی سب اشاعتیں ازراہِ شفقت بھیج دی ہیں۔ اس اخبار کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں اور ان کا علمی معیار بھی بلند ہوتا ہے۔ اس میں اُردُو کی بعض نظمیں شایع ہوئی ہیں جو انگریزی وزن کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ لکڑی پر بنائی ہوئی تصویروں کے عکس بھی ان میں شایع ہوتے ہیں۔ ضمیموں میں بعض مذہبی کتابوں کے ترجمے برابر

نکلتے رہتے ہیں۔ چناں چہ The Pilgrim's Progress" "The Blood of Christ"
"The Fountain of Life" اور "The Closer Walk" "The Missionary Flood"
کے ترجمے شایع ہو چکے ہیں ان ترجموں کے سوا "عیسائیت کی تاریخ"
"سینٹ جیک کی تفسیر" اور "القاب المسیح" بھی شایع ہو چکی ہیں۔
لاہور سے Punjab Tract & Book Society کے زیرِ اہتمام
اُردو میں ایک رسالہ جاری ہوا ہے جس کا نام "حقیقی عرفان" ہے۔

"کوی بچن سدھا" ہیں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ہندی کتابوں کے اقتباسات شایع ہوتے ہیں۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ اخبار اُردو اور ہندی کے دوسرے اخباروں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مدیر بابو ہری چندر نے اس اخبار کی ۹ مارچ ۱۸۷۲ء کی اشاعت میں ہندستان کی رائے عامہ کے متعلق بحث کی ہے۔ اسی موضوع پر سید محمود نے ایک دل پزیر تقریر کی تھی جس کے متعلق مَیں ۱۸۷۱ء کے مقالے میں ذکر کر چکا ہوں۔ بابو ہری چندر نے بھی بالکل وہی اِستدلال پیش کیا ہے جو سید احمد خاں کے قابل فرزند نے پیش کیا تھا۔ دونوں کی فکر کا انداز بالکل ایک سا معلوم ہوتا ہے۔ ہندستان میں مذہبی اختلاف کی وجہ سے فکر و نظر کی ایسی مشابہت قابلِ تعجب معلوم ہوتی ہے۔ بابو ہری چندر نے اپنے مضمون کے اختتام پر اسی قسم کی خواہشات کا اظہار کیا ہے جو عام طور پر تعلیم یافتہ ہندو ظاہر کیا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :- "جب تک عام طور پر یہ خواہش لوگوں میں نہیں پیدا ہوگی کہ وہ توہمات کے بوجھل جُوتے کو اُتار پھینکیں، اس وقت تک

تک ہندستان کی نجات کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ ضرورت اس کی ہو کہ فرقے واری تنگ نظری کے کالے بادل مغربی تہذیب و تمدن کی شعاعوں سے دُور ہوں اور پھر ہم اس قابل ہو سکیں کہ عام نقطۂ نظر سے اپنے رسم و رواج پر تنقید کر سکیں۔ اس وقت یہ ممکن ہوگا کہ ہم اپنی قومی ترقی کی عمارت کو اتحاد کی بنیادوں پر کھڑا کر سکیں گے اور دنیا کی قوموں کی اوّلین صف میں جگہ پا سکیں گے۔"

متذکرہ بالا اخبار کی گزشتہ ۲ ر اکتوبر کی اشاعت میں ہندی زبان کے متعلق ایک نہایت دل چسپ اور فاضلانہ مضمون شائع ہوا ہی۔ میرے قابل شاگرد مسٹر گستاؤ گارزنے، جو پیرس کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک نہایت ممتاز رکن ہیں، اس مضمون کا مندرجۂ ذیل الفاظ میں خلاصہ بیان کیا ہی:-

"زبان کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) روزمرّہ (۲) شاعری کی زبان، اور (۳) نثر کی زبان۔ اس بات کا تعین کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہی کہ صوبہ جاتِ شمال مغربی کی روزمرّہ کیا ہی۔ دہلی اور دوسرے بڑے شہروں میں کھتری، اگروال اور دوسری مغربی ذاتوں کے لوگ ہندی نہیں بولتے۔ ہر کوس پر بولی بدلتی جاتی ہی۔ بنارس کے قدیم باشندے مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ تانبے کے برتن بنانے والوں کی ایک بولی ہی اور کلکتہ کے بنیے ایک اور بولی بولتے ہیں۔ عوام الناس کی بولی کے علاحدہ محاورے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہی کہ بنارس

کی قدیم ترین زبان وہ ہی جو وہاں کے ڈوم بولتے ہیں۔ اس بات کا اچھی طرح یقین ہی کہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پچھم کی طرف کی ہی۔ بنارس سے تھوڑے فاصلے پر گنگا پار جائیے تو رام نگر میں بالکل دوسری ہی بولی آپ کو سنائی پڑتی ہی۔ یہ بولی مرزا پور کی بولی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہی۔ غرض کہ مختصر طور پر یہ کہنا درست ہی کہ صوبہ جاتِ شمال مغربی میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اگرچہ چند شہر ایسے ضرور ملتے ہیں جہاں کھڑی بولی بولی جاتی ہی لیکن یہ کہنا دُرست نہ ہوگا کہ کھڑی بولی صوبہ جاتِ شمال مغربی کے سب لوگوں کی مادری زبان ہی۔

صوبہ جاتِ شمال مغربی کی شاعری کی زبان برج بھاشا ہی اور اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ برج بھاشا کا استعمال قدیم زمانے سے یہاں چلا آرہا ہی اگرچہ تاریخی طور پر اس کا ذکر اکبر کے زمانے سے ملتا ہی۔ ملک محمد جائسی، چند اور تلسی داس کے طرزِ نگارش میں بے قاعدگی پائی جاتی ہی۔ بیٹں نے ذاتی طور پر کھڑی بولی میں شعر کہنے کی کوشش کی لیکن اس میں کام یاب نہ ہو سکا۔ اس سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ شاعری کے لیے دراصل برج بھاشا ہی موزوں ہی بعض شاعروں نے بندھیل کھنڈی میں بھی اظہار کیا ہی اور بعض نے

پنجابی اور مارواڑی میں شعر کہے ہیں۔

متذکرہ بالا مضمون نگار نے مختلف بولیوں کے مختصر نمونے دیے ہیں۔ کھڑی بولی کا ایک دوہا بہ طورِ مثال پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ مندرجۂ ذیل رائے ظاہر کی ہے:۔ "یہ شاعری کس قدر بوجھل معلوم ہوتی ہے! میں نے اس پر اکثر غور کیا ہے کہ کھڑی بولی میں شعر کیوں نہیں کہے گئے اور مجھ پر یہ راز کھلا کہ چوں کہ اس زبان کے افعال اور دوسرے اجزاے کلام لمبے لمبے ارکان تہجی پر مشتمل ہوتے ہیں اس لیے وہ شعر کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ اِس مثال سے سب پر یہ بات روشن ہو جانی چاہیے کہ شاعری کے لیے برج بھاشا خاص طور پر موزوں ہے اور اس کو دوسری زبانوں پر فوقیت حاصل ہے"

"زبان کی تیسری قسم کا اظہار نثر میں ہوتا ہے۔ اس کے متعلق بہت کچھ اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نثر لکھنے میں اُردو کے لفظ کثرت سے استعمال کرنے چاہییں اور دوسرے کہتے ہیں کہ نہیں سنسکرت کے لفظوں کو ترجیح دینی چاہیے۔ چوں کہ اپنے اپنے رُجحان کے مطابق لوگ ہندی نثر لکھتے ہیں اس واسطے اس کی کوئی متعین شکل نہیں پیدا ہو سکی"۔

ہندی نثر لکھنے میں جو رُجحان پائے جاتے ہیں ان کی مثالیں مضمون نگار نے پیش کی ہیں اور انھیں مندرجۂ ذیل قسموں میں تقسیم کر دیا ہے:۔

(۱) ایسی ہندی نثر جس میں سنسکرت کے لفظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہوں۔

(۲) ایسی ہندی جس میں سنسکرت لفظ کم ہوں۔
(۳) صحیح ہندی۔
(۴) ایسی ہندی جس میں دوسری زبانوں کے لفظوں کی آمیزش ہو۔
(۵) ہندی جس میں فارسی کے لفظ استعمال کیے گئے ہوں۔
(۶) وہ ہندی جس میں ایسے انگریزی کے لفظ استعمال ہوتے ہوں جو اہلِ ہند بلا تکلف بولتے ہیں۔
(۷) ایسی ہندی جس میں پوربی یا بنارس کے قریب کی بولیوں کی آمیزش ہو۔
(۸) ایسی ہندی جس میں بنارس کے آس پاس کے اَن پڑھ لوگوں کے محاورے استعمال کیے گئے ہوں۔
(۹) وسطِ ہند کی ہندی۔
(۱۰) بنگالیوں کی ہندی۔
(۱۱) انگریزوں کی ہندی۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "میں اس موقع پر یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتا کہ کون سی ہندی قابلِ ترجیح ہے۔ لیکن اگر میری رائے دریافت کی جاتے تو میں کہوں گا کہ نمبر۲ اور نمبر۳ کی زبان میں جو طرزِ نگارش ملتا ہے وہ یقیناً قابلِ قبول اور قابلِ تقلید ہے۔ اب اگر اس کے متعلق تحقیق کی جاتے کہ ہندی کا آغاز کیوں کر ہوا تو اس میں شک و شبہے کی گنجایش نہیں کہ یہ زبان پچھم سے آئی پنجابی، برج بھاشا اور دوسری پچھم کی بولیوں کی آمیزش سے یہ بنی اور آخر میں اس کا سلسلۂ نسب ناگ بھاشا سے مل جاتا ہے۔"[۱]

(حاشیہ صفحہ ۲۲۴ پر دیکھیے)

علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۶ جنوری ۱۸۷۲ء میں پندرہ اشعار کی ایک مثنوی شایع ہوئی ہی جو نواب رام پور کی فرمایش پر ایک میلے کے متعلق لکھی گئی ہی۔ یہ میلہ ۲۷ مارچ سے شروع ہوتا ہی اور ۳ اپریل تک رہتا ہی۔ رام پور کے قریب "باغ بے نظیر" میں یہ میلہ لگتا ہی۔ جوق در جوق لوگ وہاں آتے ہیں۔ رام پور کو مسلمان لوگ مصطفیٰ آباد بھی کہتے ہیں۔ میلے کا مقام شکار گاہ سے بالکل مِلا ہوا ہی اور" درگاہ قدم رسول" بھی وہیں قریب ہی۔ اِس مثنوی میں نواب کی تعریف اور میلے کا حال بیان کیا گیا ہی۔ ہر سال لوگ میلے کے منتظر رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ درگاہ پر حاضری کے لیے آتے ہیں اور تاجر پیشہ ہندستان کے ہر حصے سے اس موقع پر اپنا مال فروخت کرنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے خوب رونق رہتی ہی۔

"اخبار انجمنِ پنجاب" خوب کام یابی کے ساتھ برابر نکل رہا ہی۔ چوں کہ میں اِس انجمن کا اعزازی رُکن ہوں اس لیے مجھے اس کے سب نمبر پہنچتے رہتے ہیں۔ اس اخبار کے جاری ہونے کے بعد انجمن کے ماہ وار رسالے کی ضرورت باقی نہیں رہی جس میں انجمن کے قواعد اور کارروائیاں شایع ہوا کرتی تھیں۔ چناں چہ اس رسالے کو بند کر دیا گیا

(حاشیہ صفحہ ۲۰۳)

ناگ بھاشا کے معنی ہیں سانپوں کی زبان۔ برہمن لوگ اپنی مقدس زبان یعنی سنسکرت کے مقابلے میں عوام کی بولیوں کو اس نام سے پکارتے تھے اس لیے کہ بدھمت اور بعض دوسرے مذہبی فرقوں نے ان عوام کی بولیوں کو ادبی مرتبے تک پہنچانے کی کوشش کی تھی (ژورنال ایشیاٹک اگست، ستمبر ۱۸۷۰ء ص ۲۱۷)

اِس اخبار کے سرِعنوان ہُما کی تصویر ہوتی ہے جس کے پھیلے ہوتے دونوں پروں کے نیچے تاج رکھے ہوتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس چڑیا کا سایہ بھی اگر کسی شخص پر پڑ جاتے تو وہ تخت و تاج کا مالک بن جاتا ہے۔ چناں چہ ٹیپو سُلطان کے تخت کی آرائش میں ہُما بنایا گیا تھا۔ اس اخبار کی ۲۶ اپریل والی اشاعت میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے متعلق ایک دل چسپ مضمون ہے۔ مسلمان اپنے کام "بسم اللہ" سے شروع کیا کرتے ہیں۔ چناں چہ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ کتابوں کے شروع میں بھی اس کا لکھنا اچھا ہے۔ اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ سرکاری طور پر جو کتابیں شایع ہوتی ہیں، ان کے شروع میں اس کا لکھنا بند کر دیا گیا۔ اس اس اخبار کی ۱۹ جولائی کی اشاعت میں اُن تحقیقات کے متعلق ایک مضمون ہے جو انجیلِ مقدس کے تخلیقِ آدم کے نظریے کے متعلق کی گئی ہیں۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ خداوند نے جو چھ دن میں دنیا پیدا کی اس سے مراد تخلیق کے چھ مختلف دوَر ہیں۔ سب سے آخری دوَر میں آدم کی تخلیق ہوئی۔ طبقات الارض کے بعض ماہروں کو انسان کی ہڈیاں ان عجیب و غریب جانوروں کی ہڈیوں کے ساتھ ملی ہیں جو قدیم زمانے میں پائے جاتے تھے۔ یہ ہڈیاں ایسے پتھروں اور ریت کے ڈھیروں میں دست یاب ہوئی ہیں جو تاریخی زمانے سے دس ہزار سال قبل کے ہیں مضمون نگار نے تمام واقعات پیش کیے ہیں اور آخر میں ایران کے فلسفی شاعر حافظؒ کی طرح وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ :-

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا

اس اخبار کی دوسری اشاعتوں میں پہیلیاں حل کی غرض سے پیش کی گئی ہیں تاکہ پڑھنے والوں کی ذہانت کی جانچ ہو سکے۔

"علی گڑھ اخبار" مورخہ ۸ مارچ ۱۸۷۲ء میں پنڈت کاشی ناتھ کا ایک خط شایع ہوا ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ سرکاری مدارس میں طلبا کو قومی شاعری کا ذوق پیدا کرنا چاہیے۔ میں اس بات میں پنڈت جی کا ہم خیال ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "ادبیات کی اصناف میں شاعری میں سب سے زیادہ دل پذیری اور خوبی پائی جاتی ہے۔ ہر قوم میں ایسے شاعر ہوتے ہیں جن کے کلام کو قبولِ عام حاصل ہوتا ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانے میں شاعری تعلیم کا جُز رہی ہے اور ان شاعروں کے کلام سے طلبا کو واقفیت حاصل کرائی جاتی ہے جنھوں نے زبان کو پاکیزہ بنانے میں حصّہ لیا ہے۔ کیا شمالی ہند میں ہمیں ایسے شاعر نہیں ملیں گے جن کا کلام قومی سرمایے کی حیثیت رکھتا ہو۔ تُلسی داس، سور داس، کیشو داس، بہاری لال اور کبیر داس کی حیثیت ہمارے دیس کے لیے وہی ہے جو انگلستان کے لیے مِلٹن، شیکسپیئر، ڈرائڈن اور پوپ کی ہے۔ ہندی کے جدید شاعر قدما سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ تشبیہ واستعارہ اور نازک خیالی میں وہ دوسری قوموں کے شاعروں کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔

ہمارے ہندی شاعر قدیم یونانی شاعروں کی طرح دیوتاؤں اور سوُرماؤں کے عشق و محبت اور ان کی مہم جوئیوں کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ان شاعروں کا کلام اس قابل نہیں کہ مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے لیکن ہماری رائے میں اگر ان شاعروں کے کلام کی ضخیم جلدوں میں سے انتخاب کیا جائے تو ایسے حصے ضرور دست یاب ہوسکیں گے جو دل چسپ بھی ہوں گے اور مفید بھی اور ان کا اخلاقی اثر طلبا پر اچھا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی شاعری کے جو حصے ہمارے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں ان کا اثر اچھا ہوتا ہے۔ تلسی داس اور بہاری لال کے ہاں آپ کو فطرت نگاری، عشق و محبت، خوف، رنج و غم اور خوشی کے منظر ملیں گے جو اگر کسی انگریزی زبان کے شاعر کے ہاں ہوتے تو قدر کی نظر سے دیکھے جاتے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ سرکاری مدارس کے نصابِ تعلیم میں ہماری شاعری کے ایسے نمونے کیوں شامل نہیں کیے جاتے جن کے متعلق واقفیت حاصل کرنا ہندستانی طلبا کا حق ہے۔ یہ سچ ہے کہ جن مدارس کے نصاب میں ہم یہ تبدیلی کرنا چاہتے ہیں ان میں ریاضی وغیرہ پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ کسی نئے مضمون کی مشکل ہی سے گنجایش نکالی جاسکتی ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ اقلیدس اور جبر و مقابلے کے بجائے فطرت کی نیرنگیاں، زمین کے طبعی تغیّرات اور دنیا کی مختلف اقوام کے رسم و رواج اور ان کے حالات بچّوں کو پڑھائے جائیں۔ شاعری میں صرف ہندی شعرا کے کلام کے

نمونے نصاب میں نہ رکھے جائیں بلکہ ساتھ ساتھ اُردو شعرا کے کلام کا انتخاب بھی ہونا چاہیے۔ اُردو شاعروں میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے غیر اخلاقی موضوعوں پر لکھا ہے لیکن ایسے بھی بہت سے شاعر ملیں گے جن کے کلام میں یہ عیب نہیں نظر آتا۔ ان کے کلام میں نازک خیالی اور شاعرانہ ذوقِ جمال کے بہترین نمونے ملیں گے۔ ذرا سی محنت سے ان شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا جا سکتا ہے جو اخلاقی اور ادبی اعتبار سے نصاب میں داخل کرنے کے قابل ہو۔"

ہندستانی شاعری کی حمایت میں صرف کاشی ناتھ نے ہی آواز نہیں بلند کی ہے۔ علی گڑھ اخبار کی ۲۹ مارچ کی اشاعت میں ایک نامہ نگار کا خط چھپا ہے جس میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ صوبہ جاتِ شمال مغربی کے مدارس میں مشرقی شاعروں کے حصّے نصاب میں داخل نہیں کیے گئے ہیں۔ نامہ نگار کے خط کے سلسلے میں اخبار کے مدیر نے لکھا ہے کہ "شاعری ایک صنعت ہے جس کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کا ذوق پیدا کرنا چاہیے۔ لیکن دشواری یہ آن پڑتی ہے کہ ہندستانی زبان کی شاعری میں سوائے دُور از کار باتوں یا ایسی تشبیہوں اور استعاروں کے کچھ نہیں ہوتا جو اخلاقی سطح سے گرے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے محکمۂ تعلیمات نے ہندستانی شاعری کے نمونے اپنی نصاب کی کتابوں میں نہیں داخل کیے۔ لیکن کاشی ناتھ کی طرح نامہ نگار کا یہ خیال بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہندستانی شاعری میں ایسے نمونے

بل سکتے ہیں جن میں بے ہودہ یا ناپاک خیالات ظاہر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ وہ اخلاق کو بہتر کرنے والے ثابت ہوں گے۔ اگر کسی یورپین زبان میں ان کا ٹھیک ترجمہ کیا جائے تو یقین ہو کہ اہلِ یورپ ہندستانی شاعری کی قدر افزائی کریں گے[1] جب مشرقی شاعری میں ایسے نمونے موجود ہیں جن میں اعلا درجے کے نفیس خیالات ادا کیے گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انھیں نصاب میں نہ داخل کیا جائے اور ہندستانی طلبا کو ان سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ہمارا خیال بھی یہی ہو کہ جس طرح نگینہ جڑا جاتا ہو اسی طرح شعر انسانی رُوح میں نقش ہو جاتا ہو۔ لوگ اشعار یاد رکھ سکتے ہیں لیکن نثر نہیں یاد رکھ سکتے۔ شعر اپنے وزن اور دل کشی کے باعث حافظے میں محفوظ رہ جاتا ہو اور جب یاد آتا ہو تو اس سے دل کو حظ حاصل ہوتا ہو۔ ان حالات کے مدِّنظر ہم نامہ نگار کے خیال سے متفق ہیں کہ اگر تعلیم سے شعر کو بالکل خارج کر دیا گیا تو اس کا بڑا اثر بچوں کی ترقی پزیر ذہنی صلاحیتوں پر پڑے گا۔ چوں کہ شعر کے مفید ہونے میں کلام نہیں اس لیے اس کا نصاب میں داخل کرنا ضروری ہو۔ پھر اس میں بھی شبہہ نہیں کہ مشرقی شعرا کے یہاں ہمیں اعلا پایے کے اور حسین خیالات ملتے ہیں۔ مشرقی شاعری میں روحانی اور دنیاوی

---

[1] میرے دوست گران جیرے دے لاگرانج نے ۱۸۲۲ء میں "ژورنال ایشیاٹک" Journal Asiatique میں ایک دل چسپ مضمون لکھا تھا جس میں اعلیٰ قسم کے خیالات ظاہر کیے گئے تھے۔ مضمون کا عنوان تھا "مشرقی شاعری کی حمایت میں"

دونوں قسم کے خیالات موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہو کہ مشرقی انشا پردازوں کی نثر میں زبان کا وہ لُطف اور فصاحت ہمیں نہیں ملتی جو شعرا کے یہاں ملتی ہو۔ نثر سے زیادہ نظم میں تصوّف کے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں اور نظم ہی کے ذریعے ہمیں رسم و رواج کے متعلق بھی زیادہ واقفیت حاصل ہو سکتی ہو۔ چناں چہ یہ خیال بالکل غلط ہو کہ مشرقی شاعری میں کوئی بات ایسی نہیں جس کا جاننا ضروری ہو۔ مشرقی شاعری کے نمونے نصاب میں رکھنے سے طلبا کے تخیل میں بلندی پیدا ہوگی اور وہ اپنے شعرا کے کلام کی باریکیاں سمجھ سکیں گے۔ ہم نامہ نگار سے متفق ہیں کہ ہندستانی بچّوں کو اپنے شاعروں کے کلام سے محروم رکھنا قابلِ افسوس امر ہو۔"

میں اوپر "منشورِ محمدی" کے متعلق ذکر کر چکا ہوں۔ اپنی شاعری کی وقعت بڑھانے کے لیے اس اخبار کے سرِ عنوان پر دو اشعار درج ہیں جن سے اس کی حکمتِ عملی واضح ہوتی ہو۔[1]

"اخبار انجمنِ پنجاب" کی ۲۲ مئی ۱۸۷۱ء کی اشاعت میں ایک دل چسپ مضمون شایع ہوا ہو جس میں انگریزوں پر یہ اعتراض کیا گیا ہو کہ وہ اہلِ ہند کو "نیم متمدّن" کہتے ہیں۔ یقیناً اس قسم کے غیر ذمے دارانہ الفاظ قابلِ ملامت ہیں۔ اہلِ ہند کی اپنی تہذیب ہو جو ہماری تہذیب سے مختلف ہو لیکن وہ زیادہ قدیم ہو۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی اپنی تہذیب ہو۔ درحقیقت خود ہماری تہذیب کے بعض اجزا مسلمانوں کی تہذیب کے رہینِ منّت ہیں۔ مسلمانوں

---

[1] یہاں ان دونوں شعروں کا فرانسیسی ترجمہ ہو۔

کی تہذیب کا اثر ہماری تہذیب پر صلیبی جنگوں کے زمانے میں پڑنا شروع ہوا۔ مسلمانوں کی بدولت ہمیں متعدد یونانی تصانیف کا حال معلوم ہوا جن کے متعلق ہم بالکل ناواقف تھے۔

لیکن مضمون نگار نے ان باتوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ وہ لفظ "تہذیب" کا وہی مفہوم لیتا ہے جو یورپین لوگوں کا نقطۂ نظر ہے۔ چناں چہ وہ کہتا ہے کہ اہلِ ہند ممکن ہے انیسویں صدی کے شروع میں "نیم متمدن" کہلانے کے مستحق ہوں لیکن اب جب یورپ کے علوم و فنون کا اس ملک میں رواج ہو رہا ہے یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ بہت جلد ان کی تہذیب یورپ کی تہذیب کی سطح پر پہنچ جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ "بلا شبہہ ایشیا میں بعض ملک ہیں جنھیں نیم متمدن کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایران، افغانستان، ترکستان اور چین وغیرہ۔ لیکن ہندستان کو اس زمرے میں داخل کرنا درست نہیں ہے۔ بعض قومیں ہیں جن میں بربریت موجود ہے، جیسے تاتاری، حبشی اور امریکہ کے بعض ملکوں کے قدیم باشندے۔ لیکن ہندستان کے لوگوں کو ان کی طرح سمجھنا انصاف سے بعید ہے۔"

"دیسی ریاستوں کے امرا بھی مغربی تعلیم و تہذیب اپنے علاقوں میں پھیلانے میں کوشاں ہیں۔ پٹیالہ، جے پور، بھرت پور، کپور تھلہ، بلرام پور اور وزیانگرم کی ریاستوں میں نہایت عمدہ طریقِ حکومت رائج ہے۔ حیدرآباد (دکن) میں سر سالار جنگ کی شخصیت اور

قابلیت کو خود انگریزی حکومت نے تسلیم کر لیا ہے۔ کشمیر میں جوالا سہاے کی انتظامی قابلیت تعریف و تحسین کی مستحق ہے نواب مردان علی کی خوبیوں کا حاکم ملنا دشوار ہے! مہاراجا پٹیالہ اور نواب علاءُالدین احمد خاں کی خوش انتظامی کی دُور دُور شہرت ہے۔ دیسی ریاستوں میں جو ترقّی ہو رہی ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہندستان میں زندگی کے ہر شعبے میں ممتاز شخصیتیں موجود ہیں۔ اہلِ ہند میں آپ کو قابل انشا پرداز، لائق فوجی افسر اور نظم و نسق کے ماہر ملیں گے۔ ہندستانی کاری گروں اور صنّاعوں کی بنی ہوئی اشیا خود اہلِ یورپ کو اچنبھے میں ڈال دیتی ہیں۔ پیرس اور لندن کی نمایشوں میں ان کاری گروں کی صنعت گری کی داد دی گئی ہے اور بڑے بڑے اخباروں نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی نقل ناممکن ہے۔ کیا کوئی یورپ کا ایسا فن ہے جس میں ہندی صنّاع امتیاز نہ حاصل کر سکے۔ جب اہلِ ہند میں یہ سب صلاحیتیں موجود ہیں تو انھیں "نیم متمدّن" کہنا کہاں تک حق بہ جانب ہوگا۔ لیکن ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی اہلِ ہند میں کوتاہیاں باقی ہیں۔ اہلِ ہند میں اپنے وطن کی دلیسی محبّت اب تک نہیں پیدا ہوئی جو یورپ

کی قوموں کا طرّۂ امتیاز ہو اور جس کی بدولت انھوں نے اس قدر ترقی حاصل کی ہو"۔

"ہمیں صرف اپنے ملک کی کاری گری اور صنعت کاری تک اپنی نظر کو محدود نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اس کی ضرورت ہو کہ دوسرے ملکوں کی صنعتوں کو سیکھیں اور ان میں کمال پیدا کریں۔ ہمیں اہلِ یورپ کی طرح اپنی تجارت کو دُنیا کے ہر گوشے میں پھیلانا ہو۔ باہر کے ملکوں سے ہمارا تجارتی تعلق بہت کمزور ہو جب یہ بات جاتی رہے گی اس وقت ہندستان انگلستان کی طرح متموّل اور دولت مند ملک ہو سکے گا۔ ہمیں اپنی زراعت کو ترقی دینا ہو اس لیے کہ اس پر مملکت کی خوش حالی کا تمام تر دار و مدار ہی۔ اس وقت ہمارے ملک میں سیکڑوں میل زمین بے کاشت اور بنجر پڑی ہوتی ہی اگر یہ سب زمین زیرِ کاشت آجائے تو اس سے بے اندازہ نفع حاصل ہوگا۔ ہمارے ملک کی ایک بڑی کوتاہی یہ ہو کہ ہم لوگ نظم و نسق اور امن و امان قائم کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ لیکن خود اہلِ ہند کا اس میں کوئی قصور نہیں اس واسطے کہ انگریزی حکومت نظم و نسق کے تمام فرائض انجام دیتی ہی۔ ہندستانیوں کو معمولی عہدوں پر مامور کیا جاتا ہو یا انھیں اعزازی ججی کی خدمت

دی جاتی ہی۔ ان عہدوں پر ہندستانی لوگوں نے اپنے فرائض اس خوبی سے ادا کیے ہیں کہ اس سے صاف ثابت ہوگیا ہی کہ وہ اس کے مستحق ہیں کہ انھیں ملک کی حکومت میں براہِ راست شریک کیا جائے۔ ان حالات میں جب کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہی کہ اہلِ ہند نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کافی ترقی کی ہی اور آیندہ ان کی ترقی کی رفتار اور تیز ہوتی جائے گی تو انھیں "نیم متمدن" کہنا کہاں تک درست ہی؟۔ اس سے ان کی سخت دل آزاری ہوتی ہی"[1]

میرٹھ کے "اخبار عالم" مورخہ ۲۵ اپریل ۱۸۷۲ء میں ایک مضمون شایع ہوا ہی جس میں ہندستان کی ادبی انجمنوں کا یورپ اور خاص کر انگلستان کی ادبی انجمنوں کے ساتھ مقابلہ کیا گیا ہی۔ مضمون نگار نے اس امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہی کہ بجاے اس کے کہ انگریزی حکومت کے زیرِ اہتمام ہندستان کے مختلف شہروں میں انجمنیں قائم ہوں جن کے مقاصد غیر متعین ہوں، یہ بہتر ہوگا کہ ان انجمنوں کے سامنے مخصوص موضوعوں کی تحقیق ہونی چاہیے جیسا کہ انگلستان میں ہی۔ اس طرح یہ ہوگا کہ علومِ انسانی کے مختلف شعبوں میں ہماری واقفیت بڑھے گی اور ہم متعین نتائج حاصل کر سکیں گے۔ مثلاً ضرورت ہی کہ جغرافیہ، آثارِ قدیمہ اور لسانیات پر تحقیق کرنے کے لیے علاحدہ علاحدہ انجمنیں

---

[1] اس مسئلے کے متعلق اسی اخبار کی ۵ جولائی کی اشاعت میں پھر بحث کی گئی ہی۔

قائم ہوں۔ لیکن ہماری رائے میں مضمون نگار ذرا جلد بازی سے کام لینا چاہتا ہے۔ ہندستان کی نشأۃ ثانیہ کی ابھی ابتدا ہوتی ہے۔ جس قسم کی انجمنوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا قائم کرنا یقیناً ضروری ہے لیکن وہ اسی وقت قائم ہوں گی جب ان کی ضرورت کا پورے طور پر احساس ہو جائے گا۔ اب بھی ہندستان میں متعدد انجمنیں ایسی ہیں جو مخصوص موضوعوں پر تحقیقات کر رہی ہیں۔ ابھی حال میں بمبئی میں ایک "زرعی انجمن" قائم کی گئی ہے۔

"اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ" اور دوسرے اخباروں کے مقابلے میں کسی طرح کم دل چسپ نہیں ہے۔ اس کی یکم نومبر ۱۸۷۲ء کی اشاعت میں دیوانِ حافظ کی ساتویں غزل کا نظم میں ترجمہ شایع ہوا ہے۔ جو بات اس ضمن میں قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ ایک ہندو کا کیا ہوا ہے جس کا نام تارا چند اور تخلص اختر ہے۔

اہلِ ہند کو انگریزی مدارس میں انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم بہ طورِ لازمی مضمون کے دی جاتی ہے۔ اس تعلیم کی بدولت نیا ہندستانی ادب پیدا ہو رہا ہے جسے ہم ہندی یوریپینی ادب کہہ سکتے ہیں۔ ہندستانی زبان کے اخبار اسی ادب کا نمونہ ہیں۔ ایسے مدارس جو کلیتاً اہلِ ہند کے ہاتھ میں ہیں بالعموم اسلامی مدارس ہیں۔ ہندو لوگ قدیم اسلامی حکومت کے مقابلے میں انگریزی راج کو ترجیح دیتے ہیں، اور پارسیوں کا بھی یہی حال ہے۔ جب سے سرکاری درس گاہوں کی تنظیم عمل میں آئی ہے اس

وقت سے انھوں نے اپنا علاحدہ تعلیمی انتظام کرنے کی طرف مطلق
کوئی توجہ نہیں کی۔ مسلمانوں کی طرح یورپین مدارس میں تعلیم
پانے کو وہ بُرا نہیں سمجھتے۔ لیکن مسلمانوں کا اس معاملے میں نقطۂ نظر
دوسرا ہے۔ میں پہلے بھی ان کی علاحدہ درس گاہوں کی نسبت ذکر
کرچکا ہوں۔ ان میں سے ایک دہلی کا مدرسۂ محمدی ہے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء
کی شورش کے زمانے میں بند ہوگیا تھا۔ بارہ برس تک بند رہنے کے
بعد پھر وہ کھُل گیا ہے اور اس میں کام جاری ہے۔ اس مدرسے میں
بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ یہ مدرسہ گلی قاسم جان
میں لال کنوئیں کے قریب واقع ہے۔ جو فاضل لوگ یہاں تعلیم
دیتے ہیں ان میں ضیا۔الدین خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
تصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور عربی علوم کا درس
دیتے ہیں[1]

شاہ آباد (بہار) میں "مدرسۂ اسلام" میں بھی اسلامی علوم کی
تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہندستانی ادب کی قدیم کتابوں کی بھی
یہاں تعلیم دی جاتی ہے۔

ہندو لوگ مسلمانوں کے ان علاحدہ مدرسوں کے مخالف
نہیں ہیں بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ وہ انھیں پسند کرتے ہیں اور ان کی
امداد بھی کرتے ہیں۔ چناں چہ راولپنڈی کے ضلع میں جو متعدد
اسلامی مدارس قائم کیے گئے ہیں، ان کی ہندوؤں نے مالی امداد
کی ہے۔ یہ مدرسے خوش حال ہیں۔ ان میں عربی اور سنسکرت کے

---

[1] اخبار انجمنِ پنجاب مورخہ ۱۶ر فروری ۱۸۷۲ء

علاوہ اُردو اور انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے[۱] ہندوستان کے ہر گوشے میں مسلمانوں میں بیداری کے آثار نمایاں ہیں اور ان میں مذہبی جوش دن بہ دن بڑھتا جاتا ہے۔ ہندوستان کے ہر حصّے میں سندھ تک ہر جگہ آپ کو یہی حال نظر آئے گا۔ بمبئی کے ناظم تعلیمات نے چار سو رُپے کا ایک انعام مقرر کیا ہے جو اُس شخص کو دیا جائے گا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بہترین مضمون لکھے گا۔ اس مضمون میں ان کی تعداد، ان کی تاریخ اور ان کی عام عمرانی زندگی پر تحقیق کے ساتھ تبصرہ ہونا چاہیے۔ یہ مضمون چاہے ہندستانی میں ہو چاہے سندھی زبان میں[۲]

وادیِ کشمیر کی آبادی کا $\frac{9}{10}$ حصّہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں زیادہ تر تو اہلِ سُنّت والجماعت ہیں اور تھوڑے سے شیعہ بھی ہیں۔ شیعوں نے ۱۸۷۲ء میں سری نگر میں ایک زمین کا ٹکڑا خریدا ہے تاکہ وہاں اپنی مسجد تعمیر کریں۔ اس جگہ کے قریب سُنّیوں کی مسجد ہے چناں چہ انھوں نے شیعوں کی مسجد کی تعمیر میں رُکاوٹیں ڈالنا شروع کیں۔ بالآخر جھگڑے تک نوبت آئی اور کئی شیعوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور ان کے مکانات جلادیے گئے[۳] یہ طریقہ جو سُنّیوں نے اختیار کیا قابلِ ملامت ہے۔ اس طرح وہ اپنے مخالفوں کو اپنا ہم خیال کبھی نہیں بنا سکتے۔

---

۱ علی گڑھ اخبار مورخہ یکم جولائی ۱۸۷۲ء

۲ Allen's Indian Mail مورخہ ۲۱ جولائی ۱۸۷۱ء

۳ علی گڑھ اخبار مورخہ ۴ نومبر ۱۸۷۲ء

ٹرکی میں بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام رؤبہ زوال ہی۔ لیکن
سال سے اس میں نئی زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ البانیہ کے
سانوں میں بھی بیداری پیدا ہو رہی ہی۔ یہ سب کچھ وزیر اعظم
دپاشا کی توجہ کا طفیل ہی۔ اُدھر خدیو مصر نے حبشہ میں یورش
ہی۔ اس کی وجہ سے بھی اسلام کی توسیع عمل میں آئے گی۔ اسلام
لے سے افریقہ کے مختلف ممالک میں حاوی ہوتا جاتا ہی۔ یہ سُن کر
ب ہوگا کہ سیرلیون Sierre Leone میں ایک اسلامی
ن ورسٹی ہی جس میں ایک ہزار طلب تعلیم پاتے ہیں اور ان تعلیم
نے والوں میں عورتیں بھی شامل ہیں۔[1]

ہندستان کے مسلمانوں میں جو عام بیداری پیدا ہوئی ہی اس
ذ تے داری ایک حد تک وہابی تحریک پر عائد ہوتی ہی۔ اگرچہ
بی تحریک سیاسی اعتبار سے ختم ہو چکی ہی لیکن تمام مسلمانوں
اس نے مذہبی جوش پیدا کر دیا ہی۔ وہابیوں کے متعلق ہم سب
نتے ہیں کہ وہ اپنے عقائد میں متشدد ہوتے ہیں۔ انھوں نے
ب مکہ فتح کیا تو سنگِ اسود کو توڑ ڈالا اس لیے کہ اس میں
ت پرستی کا شائبہ تھا۔ مدینے میں انھوں نے مسلمان اولیا کے
روں کو منہدم کر دیا اس واسطے کہ توہم پرست مسلمان ان کا
رام کرتے تھے۔ تمام مسلمان اور خاص طور پر وہابی لوگ مورتوں
رام سمجھتے ہیں اور انھیں مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

---

[1] علی گڑھ اخبار مورخہ ۵ نومبر ۱۸۷۲ء۔ یہ برطانوی نوآبادی افریقہ کے مغربی
ل پر لائبیریا کے قریب واقع ہی۔ مترجم)

مسلمانوں کی عام بیداری جس کے پیدا کرنے میں ایشیا کی تمام اقوام مدد دے رہی ہیں، تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ میرے فاضل دوست اے اسپرنگر کا خیال ہے کہ "نصف صدی کے اندر اہلِ ایشیا مغربی تہذیب و تمدن پر اپنا اثر ڈالنے لگیں گے اور ذہنِ انسانی کی ترقی کو اعلا بلندیوں تک پہنچا دیں گے۔ وہ ایسی کتب تصنیف کریں گے جن سے نہ صرف انھیں بلکہ اہلِ یورپ کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ اہلِ مشرق ذہانت میں یورپین لوگوں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض لحاظ سے ان سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ وہ مستقبلِ قریب میں انسانیت کی ترقی کے ضامن بن جائیں گے۔ دوسری صدی عیسوی میں اور اس کے بعد بھی علوم و فنون کے بڑے بڑے محقق شام اور شمالی افریقہ کے لوگ تھے۔ کیا یہ بات ناممکن ہے کہ ان علاقوں میں پھر بڑے بڑے فاضل پیدا ہوں اور دنیا کو اپنے علم سے مستفید کریں۔"

میں نے اپنی کتاب "ہندستانی زبان اور ادب کی تاریخ" (ص ۱۰) پر یہ ذکر کیا تھا کہ شمالی چین میں نئی اسلامی سلطنتیں قائم ہو رہی ہیں۔ اس کے متعلق اس وقت میں کچھ قطعی معلومات آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا۔ یونان کے صوبے میں جو چین کے جنوب مغرب میں واقع ہے، مسلمانوں نے ایک نئی مملکت قائم کر لی ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ یہ لوگ پانتھے کہلاتے ہیں۔ ان کے سرگروہ نے ابھی حال میں اپنی سفارت لندن بھیجی ہے۔ یونان کے علاقے میں مسلمانوں کی

اتنی زبردست تعداد کے متعدد وجوہ ہیں۔ ایک افسانوی روایت یہ مشہور ہے کہ حضرت نبی کریمؐ کے چچا حضرت امیر حمزہؓ نے اس علاقے پر حملہ کیا تھا اور یہاں عربوں کی ایک نوآبادی بسائی تھی۔ اس قسم کے دوسرے مبہم جوئی کے افسانے حضرت امیر حمزہؓ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ لیکن غالباً اس علاقے میں بہت قدیم سے مسلمانوں کی چھوٹی سی آبادی موجود رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ تبلیغ واشاعتِ دین کے ذریعے اور لاوارث بچّوں کو مسلمان بنا کر تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ بہ ہر حال ہمیں پورے طور پر معلوم ہے کہ چینی حکومت نے اس علاقے کے مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ لیکن کچھ عرصے سے چینی حکومت نے مسلمانوں کی مخالفت شروع کردی تھی اور ان کے مٹانے کے درپے ہوگئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ مسلمان مزدوروں نے چینی حکومت کی حکم عدولی کرنے کا فیصلہ کرلیا جس پر شہنشاہِ چین کُل مسلمانوں کے درپے ہوگیا۔ چناں چہ اس علاقے کے تمام مسلمانوں نے چینی حکومت کے خلاف اپنا متحدہ محاذ قائم کرلیا اور چینی حکّام کو قتل کر ڈالا جو اُن پر طرح طرح کے ظلم کرنے لگے تھے۔ بہ تدریج مسلمانوں میں تنظیم پیدا ہوگئی۔ انھوں نے اپنے امرا میں سے ایک کو جس کا نام سلیمان ہے اپنا سلطان منتخب کرلیا۔ سلیمان اس وقت مسلمانوں کی سربراہی کر رہا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے یونان کے صوبے کے بیش تر حصّے پر قبضہ کرلیا۔ اب سولہ سال سے یونان میں اسلامی شریعت کے مطابق خود مختار حکومت قائم ہے۔ اس نئی مملکت کا نام

تے لی فو (TALIFU) ہی۔ یہ مملکت رقبے میں برطانیۂ عظمٰی کے برابر ہی۔ اس مملکت کے آس پاس کے صوبوں میں بھی چینی حکومت کے خلاف بغاوتیں ہو رہی ہیں اور وہاں کے مسلمان آپس میں اتحاد پیدا کر رہے ہیں۔

شہزادہ حسن، سلطان سلیمان کے فرزند ہیں۔ وہ اس سفارت کے صدر ہیں جو انگلستان بھیجی گئی ہو اور جس کی نسبت میں نے ابھی اُوپر ذکر کیا ہی۔ شہزادہ حسن نے انگلستان روانہ ہونے سے قبل اپنے والد کی حکومت کو مستحکم کرنے کی تمام ممکن تدابیر اختیار کیں اور شمالی اور مغربی چین کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی پوری کوشش کی۔ انھوں نے شمال اور مغربی چین کے مختلف علاقوں میں سفر کیا اور اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت کی۔ وہ پوشیدہ طور پر شہر پیکنگ میں کچھ عرصے تک مقیم رہے تاکہ وہاں ایک جماعت قائم کریں جو ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتی ہو۔ اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی بیس ہزار سے زائد ہی اور وہاں متعدد مساجد بھی ہیں۔ ممکن ہی شہزادہ حسن کے پیشِ نظر انگلستان آنے سے یہ مقصد ہو کہ وہ انگریزی حکومت کو اس بات پر رضامند کریں کہ اگر چین کے مسلمان موجودہ حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں تو ان کی مدد کی جائے۔ چین میں مسلمانوں کی مذہبی تبلیغ و اشاعت اس کامیابی کے ساتھ ہو رہی ہی کہ ممکن ہی کہ وہاں وہ وہ قوت حاصل کرلیں۔

چنگ ہان فو، چین سی کے صوبے کا صدر مقام ہی۔ یہاں

مسلمانوں کی آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں ان سب کو چینی حکومت نے قید کر رکھا تھا اور ان کو شہر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی شخص ان میں سے شہر کی چاردیواری کے باہر قدم رکھتا تو وہ قتل کر دیا جاتا۔ چین کے اور دوسرے بڑے شہروں میں بھی مسلمانوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ حکومتِ وقت کو ان سے بڑا خطرہ ہے اس واسطے کہ ان میں پھر اسی قسم کا مذہبی جوش پیدا ہو رہا ہے جس نے انھیں دنیا کے بڑے حصّے کو فتح کرنے پر اُکسایا تھا۔ ان لوگوں میں عام طور پر ایک پیشین گوئی کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں یہ حکم لگایا گیا ہے کہ چین کی موجودہ سلطنت کا تختہ اُلٹنے والا ہے اور اس کی جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی۔[1]

کُلجا، اس نام کے صوبے کا صدر مقام ہے۔ گزشتہ سال روسی سپاہ نے اس شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس شہر کی سات ہزار سات سو آبادی ہے جس میں چار ہزار نو سو مسلمان ہیں۔ چینیوں کے یہاں صرف دو مندر ہیں اور مسلمانوں کی ۲۶ مسجدیں ہیں۔ چھ مدرسے ہیں، پانچ مسلمانوں کے اور ایک چینیوں کا۔ اس علاقے کے دوسرے شہروں کے اگر اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کی آبادی چینیوں کے مقابلے میں بعض مقامات پر زیادہ ہے۔

چینی مسلمانوں کے زیرِ اہتمام مطابع چل رہے ہیں جن میں عربی کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ متن کے ساتھ چینی ترجمہ بھی درج

---

[1] پال مال گزٹ۔ مورخہ ۲۹ جون ۱۸۷۲ء

کیا جاتا ہی۔ہمارے مدرسۃ السنۂ مشرقی میں ان مطابع کی بعض چھپی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔

سید احمد خاں کے فرزند ارجمند سید محمود نے لندن اور کیمبرج میں اپنی تعلیم کی تکمیل کر لی ہی اور وہ بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندستان واپس گئے ہیں جب وہ واپسی پر پیرس میں ٹھیرے تھے تو اس وقت مجھے ان سے ملنے کے متعدد مرتبہ موقعے ملے اور ان سے بہت دل چسپ گفتگوئیں رہیں۔اس نوجوان فاضل شخص کی دِلی تمنّا ہی کہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسی درس گاہ قائم کی جائے جو کیمبرج کے نمونے کی ہو۔موصُوف کی اس خواہش کا چرچا اس وقت ہندستان میں ہو رہا ہی۔چناں چہ "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۲۱ مئی ۱۸۷۲ء میں ایک نامہ نگار نے اس کے متعلق لکھا ہی[1]۔

"ہمارا مستقبل یقیناً تاریک ہی۔اگر ہم ترقی کے راستے میں پیچھے رہ گئے یا اگر ہم نے صرف اس پر اکتفا کیا کہ اپنے شان دار ماضی کی مدح سرائی کرتے رہیں۔اس وقت جو تجویز زیرِ غور ہی اس سے ہماری معاشری حیثیت سُدھر جائے گی اور ہمارے نوجوانوں کو اعلا عُہدے حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہو جائیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ اس تجویز کے مطابق حکومت سے آزاد ایک اپنی درس گاہ قائم کریں۔چوں کہ اودھ کے متموّل

[1] یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہی۔(مترجم)

مسلمانوں کے زیرِ غور بھی اسی قسم کی تجویز ہی اس لیے ضروری ہی کہ ان دونوں تجویزوں کو ملا دیا جائے۔ اس درس گاہ میں علومِ دین، اسلامی فقہ، قدیم السنہ اور مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا اور اس کے پہلو بہ پہلو مغربی علوم و فنون کی تعلیم دی جائے گی۔ اس وقت یہ ضروری نہیں کہ پروفیسروں کی بڑی تعداد موجود ہو۔ ہم چھوٹے پیمانے پر اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔ گنگا اور جمنا کے منبع کو دیکھو تو چھوٹے چھوٹے چشمے نظر آئیں گے۔ خود آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات ابتدا میں چھوٹے چھوٹے مدرسے تھے۔ اس قسم کی درس گاہ کے لیے لکھنؤ کا شہر نہایت موزوں ہی اس لیے کہ یہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہی اور اس کے نواح میں متموّل مسلمان آباد ہیں۔ اودھ کا صدر مقام علم و فن کے لحاظ سے دہلی کا مقابلہ کر سکتا ہی۔"[1]

"علی گڑھ اخبار" کے نامہ نگار کی تجویز پر نہایت سنجیدگی سے عمل شروع ہو گیا ہی اور علی گڑھ میں ایک مجلس اس غرض سے قائم کی گئی ہی تاکہ درس گاہ قائم کرنے کے لیے چندہ فراہم کرے اس درس گاہ کا نام "مدرسۃ العلوم مسلمانان" تجویز کیا گیا ہی۔ ہندستان کے مسلمانوں کے قدیم علمی مرکز دہلی، آگرہ اور لکھنؤ تھے۔ لیکن

---

[1] یہ بات قابلِ لحاظ ہی کہ دہلی کے بعد لکھنؤ وہ شہر ہی جس نے ہندستانی زبان کے سب سے زیادہ تعداد میں شاعر پیدا کیے ہیں۔ مَیں نے اپنی کتاب "ہندستانی زبان اور ادب کی تاریخ" میں ساڑھے تین ہزار شاعروں کا ذکر کیا ہی۔ ان میں ۶ سو کا تعلق دہلی سے ہی اور ۴۲۰ لکھنؤ کے ہیں۔

ان سبھوں کے مقابلے میں علی گڑھ کو ترجیح دی گئی ہے۔[1] اس مدرسے کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی جائے گی۔ اس درس گاہ میں مسلمانوں کے لیے دینی اور دنیاوی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ مجلسِ تعلیمی جو مقرر ہوئی ہے اس نے اپنا تعلیمی پروگرام شایع کیا ہے۔ مولوی سید احمد خاں بہادر اس مجلس کے معتمد ہیں۔ ممدوح نے اس سارے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ذریعۂ تعلیم ہندستانی رکھا جائے گا۔[2] سید احمد خاں نے اپنے پروگرام کی تفصیلات شایع کی ہیں۔ وہ رقم کی فراہمی کے لیے نہایت مؤثر ثابت ہوں گی۔ جب ضروری رقم فراہم ہو جائے گی تو فوراً تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا اور کالج کا افتتاح کر دیا جائے گا۔ سرکاری طور پر گورنر جنرل اور گورنر صوبہ جاتِ شمال مغربی نے یقین دلایا ہے کہ وہ اس منصوبے کی تکمیل میں ہر طرح تعاونِ عمل کریں گے اور ہاتھ بٹائیں گے۔ نئے وائس رائے لارڈ نارتھ بروک نے چھ ہزار کا وعدہ کیا ہے۔ دوسرے لوگ بھی چندے دے رہے ہیں۔ گزشتہ اگست کے مہینے میں ۳۰ ہزار ایک سو چھتیس رُپے جمع ہو چکے تھے۔

بنارس کی "انجمنِ ترقیِ تعلیمِ مسلمانان" کی اپیل پر کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ مسلمان طلبا سرکاری مدارس میں تعلیم کے لیے کیوں نہیں جاتے، ملک کے مختلف گوشوں سے ۲۵ مضامین

---

[1] "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۵ و ۱۹ اپریل ۱۸۷۲ء

[2] مجھے دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اس ضمن میں لاطینی زبان کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے۔

بھیجے گئے ہیں[۱]۔ ان میں صرف تین مضمون ایسے ہیں جو اشاعت اور معاوضے کے قابل تصور کیے گئے۔ باقی مضمون بھی اچھے خاصے ہیں۔ چناں چہ انجمن کے رُکن مولوی احمد شفیع نے، جو وزیر آباد کے رہنے والے ہیں یہ تجویز پیش کی ہے کہ ان مضامین سے استفادہ کرنے کے لیے اُنھیں محفوظ رکھا جائے اور آیندہ یا تو حکومت سے درخواست کی جائے کہ ان کی اشاعت کا انتظام کرے یا انھیں طبع کرانے کے لیے سرمایہ چندے سے جمع کیا کرے۔" علی گڑھ اخبار" کے مدیر کی یہ رائے ہے کہ ان مختلف رسالوں کا خلاصہ تیار کیا جائے تاکہ جو اہم باتیں ان میں بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں آجائیں۔ اس طرح اس خلاصے کی ایک چھوٹی سی جلد تیار ہو جائے گی۔ اہلِ ہند اس قسم کے خلاصوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ چناں چہ ان کے یہاں مَثل مشہور ہے کہ" دریا کوزے میں"۔ ہم بھی" علی گڑھ اخبار" کے مدیر سے اس باب میں ہم خیال ہیں۔ اس طرح اہلِ ہند کو اور ان یورپین لوگوں کو جو ہندستان کے ساتھ دل چسپی رکھتے ہیں، ان سب دلائل کا عِلم ہو سکے گا جو ان رسالوں میں بیان کیے گئے ہیں[۲]۔

یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ حکومتِ ہند حتی الامکان ہندستان کے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی پوری کوشش اور ہمت افزائی کر رہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ سوائے پنجاب اور صوبہ جاتِ شمال مغربی

---

[۱] علی گڑھ اخبار۔ مورخہ ۱۹ جولائی ۱۸۷۲ء

[۲] انڈین میل۔ مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۷۲ء

کے اور دوسرے حصّوں کے مسلمان نہ صرف مغربی علوم میں پیچھے ہیں بلکہ عربی فارسی علوم کی طرف بھی زیادہ راغب نظر نہیں آتے۔

ہم نے یہ رائے ان اعداد و شمار کی بنا پر قائم کی ہی جو حکومت کے شعبۂ نظارتِ تعلیمات نے مختلف مدارس کا معائنہ اور اس مسئلے کے متعلق تحقیق کر کے قائم کی ہی۔ اس حالت کے وجوہ معلوم کرنا مفید ہی تاکہ اس میں تبدیلی کی تدابیر اختیار کی جا سکیں۔ ہم نے ابھی جن مضامین کا ذکر کیا ہی ان میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہوگی۔

"اخبار انجمنِ پنجاب" کے مدیر کی رائے میں اس جگہ مختصر طور پر بیان کرتا ہوں:- "ہندستان کے مسلمانوں اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں میں بنیادی فرق ہی جس کو تسلیم کرنا ضروری ہی اور جسے سرسری نظر میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہی۔ ہندستان کے باہر دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کا اپنے مذہب سے حقیقی تعلق ہی۔ ہندستانی مسلمان بھی مذہب کو عزیز رکھتے ہیں لیکن مذہبی احکام سے زیادہ ان پر رسم و رواج کا اثر ہی۔ یہی فرق ہی جو انھیں باہر کے مسلمانوں سے علاحدہ کرتا ہی۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ہم یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہی کہ ہندستان کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کو بُرا سمجھتے ہیں حالاں کہ انگریزوں کا اہلِ کتاب میں شمار ہوتا ہی۔ کہا جاتا ہی کہ یہ رسم و رواج کا معاملہ ہی۔ جو ان کے بزرگوں کے وقت سے غلط خیالات چلے آرہے ہیں انھی پر وہ کاربند ہیں لیکن تعزیہ داری

کی رسم کو کیا کہا جائے گا جو صرف ہندستان کے مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ باہر کے مسلمان اس سے ناواقف ہیں۔ قبر پرستی کی مثال اسی قسم کی ہے۔ یہ تمام رسوم شریعتِ اسلامی کے منافی ہیں۔ ہندستانی مسلمان اپنی ان رسوم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے بہت سے رواج ان میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ انھوں نے ہندوؤں کی بہت سی رسوم اختیار کر لی ہیں وہ بھی ان کی خاطر شادی بیاہ کے موقع پر بے اندازہ خرچ کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندستان کے مسلمانوں میں اس وقت جو رسوم پائی جاتی ہیں وہ سب دینِ اسلام کے خلاف ہیں۔ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ یہ رسوم شریعت کے مطابق نہیں ہیں اگرچہ ان پر صدیوں سے عمل ہو رہا ہے۔ ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچّوں کی ختنہ کرائیں اور اپنی شریعت کی تعلیم سے اپنے بچّوں کو آگاہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بچّوں کو انگریزی یا اور کوئی زبان شروع کرانے سے پہلے وہ قرآن اور فارسی کی بعض کتابیں پڑھاتے ہیں جن کا پڑھنا مذہبی تعلیم کا جُز تصوّر کیا جاتا ہے۔ بچّوں کی عمر کا ابتدائی حِصّہ اس طرح گزرتا ہے۔ اب جب کہ سرکاری مدرسے میں داخل ہوتے ہیں تو بہ نسبت ہندو طلبا کے جنھیں مذہبی تعلیم میں وقت نہیں صرف کرنا پڑتا، ان کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے مسلمان بچّے دوسرے مذاہب کے بچّوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے سے عربی اور فارسی علوم کو

جو اہمیت حاصل تھی وہ بعد میں باقی نہیں رہی۔ اِس زمانے میں ہندستان کے مسلمان علوم کو حاصل کرنے کی جانب بہ نسبت اُس زمانے کے زیادہ مائل تھے۔ بہت سے فاضل لوگ ایسے موجود تھے جو اپنے علم کی بدولت فضیلت حاصل کرتے تھے۔ اس زمانے کے مسلمان اپنی تعلیم سے رُوحانی اور دنیاوی عقل کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ تعلیم سے دنیاوی فوائد کم حاصل ہوتے تھے لیکن پھر بھی مسلمانوں کو اس کا اندازہ تھا کہ دنیاوی مفاد کی خاطر کس قدر تعلیم درکار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہندستان کی دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان کس طرح تعلیم میں امتیاز حاصل کر سکتے ہیں۔

بعض مذہبی رسُوم کی وجہ سے جیسا کہ ہم نے ابھی اُوپر بیان کیا، مسلمان بچّے جب سرکاری مدرسے میں پہنچتے ہیں تو ان کی عمر بہ نسبت دوسری قوموں کے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزی تعلیم میں دوسروں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہندو بچّوں کو اس قسم کی کوئی خاص دشواری نہیں پیش آتی۔ وہ بالکل کم عمری میں مدرسے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مسلمان بچّے عمر بڑھنے پر مدرسے میں داخل ہوتے ہیں اور جب تعلیم ختم کرنے کی نوبت آتی ہے تو ان کی عمر بہت زیادہ ہو چکتی ہے۔ وہ اپنے ہم جماعت ہندو طلبا کے مقابلے میں شاذ و نادر ہی امتیاز حاصل کر سکتے ہیں۔ اس خرابی کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مدارس علاحدہ قائم کریں۔ ان مدارس کے اخراجات نصف حکومت برداشت کرے

اور نصف وہ خود برداشت کریں۔ ان مدارس میں قرآن اور مذہبی کتابوں کی تعلیم کا عام تعلیم کے ساتھ انتظام کیا جاسکتا ہے۔

ہماری رائے ہے کہ سرکاری مدارس میں بھی قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ ایسا کرنا حکومت کی حکمتِ عملی کے خلاف ہے جو ان مدارس کو چلاتی ہے۔ لیکن یہ کیا جاسکتا ہے کہ نصاب میں وہ کتابیں رکھی جائیں جن میں دوسرے مذاہب کی بُرائی نہ ہو۔ اگر اس قسم کا سرکاری مدارس میں انتظام کیا گیا تو صِرف ہندستان کے طلبا ہی جوق جوق نہیں آئیں گے بلکہ بخارا اور دوسرے قریب کے اسلامی مرکزوں سے طالبِ علم ہندستانی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا کریں گے۔ اگر ایسا انتظام کِیا گیا تو مسلمان انگریزی حکومت کے بہت شکر گزار ہوں گے کہ اس نے ان کے بچّوں کی تعلیم کے لیے سہولتیں فراہم کیں۔ اگر حکومت چاہتی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی طرح مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کرے تو ضروری ہے کہ عربی اور فارسی علوُم کی تعلیم ان لوگوں کے ذریعے دی جاتے جو اپنی قابلیت اور ذاتی وجاہت میں مُسلّم ہیں۔ اگر ایسا نہیں کِیا گیا تو لوگ اس تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہ کریں گے۔ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرے گا کہ وہ کسی مسجد کا مُلّا ہو جائے یا پیرزادہ کہلانے لگے یا تعویذ گنڈے لکھا کرے۔ عربی اور فارسی علوُم کی تحصیل کے بعد بھی لوگ روٹیوں کو محتاج رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ کسی مسجد کے مدرسے میں پڑھانے

لگتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو دیکھ کر نوجوان مسلمان عربی فارسی کے علوم کو بے سود تصور کرنے لگتے ہیں[1]"۔

بھوپال کے "عمدۃ الاخبار" کے مدیر نے اس مسئلے کے متعلق یوں اظہارِ خیال کیا ہے: "یورپ کے تمام موجودہ ذہنی علوم ہندستان کے مسلمانوں میں بہت جلد مقبول ہو سکتے اور پھیل سکتے ہیں اس واسطے کہ یہ علوم دوسری شکل میں ان کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ انھوں نے ان علوم کو یونان سے براہِ راست لیا تھا جب ان میں ان کے حاصل کرنے کا شوق تھا۔ ابوجعفر منصور نے، جو بنو عباس کا دوسرا خلیفہ ہوا ہے، اقلیدس کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کرایا تھا۔ اس سے عربوں میں یونانی علوم حاصل کرنے کا شوق اور زیادہ پیدا ہوا۔ چناں چہ خلیفہ مامون نے ابو نصر فارابی، بوعلی سینا، قاضی ابوولید بن رشید اور ابوبکر بن صالح کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ یونانی علوم کو عربی میں منتقل کریں۔ عباسیوں اور برامکہ کے عہدِ حکومت میں یونانی علوم و فنون کی بڑی قدردانی ہوئی۔ دمشق میں ۲۱۴ ہجری میں مامون کے زمانے میں یحیٰی بن منصور نے رصدگاہ بنوائی۔ ناصرالدین طوسی اور علی بن شاطر نے بھی رصدگاہیں بنوائیں۔ ہندستان میں بھی مسلمان حکمرانوں کے عہدِ حکومت میں یہ علوم پھیلے اور مصر میں بھی ان کی اشاعت ہوئی۔ لیکن ان ممالک میں ان علوم کو زیادہ مقبولیت نہیں حاصل ہوئی۔ اس وقت اگرچہ ہندستان میں علمی زوال چھایا ہوا ہے لیکن مصر میں فرانسیسی اور انگریزی زبان سے ترجمے ہو رہے ہیں اور علوم کو خوب ترقی حاصل

---

[1] یہ فرانسیسی عبارت کا ترجمہ ہے (مترجم)

ہو رہی ہے اور مدارس میں تعلیم کا انتظام ہے۔ علمِ نباتات، علمِ حیوانات، زراعت، فلکیات اور طب پر مصر میں جو کتابیں چھپ رہی ہیں، وہ میری نظر سے گزریں۔ انھیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ان علوم کو نئے طرز پر پڑھایا جا رہا ہے اور پرانے طریقوں کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ مختلف علوم کی بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو ترجمے کے ذریعے مصر میں روشناس نہ ہو چکی ہوں۔ مصر میں ذریعۂ تعلیم عربی زبان ہے جو ملکی زبان ہے۔ لیکن چوں کہ یہ ایک مذہبی زبان ہے اس لیے ہندستان کے مسلمان بھی اسے سیکھتے ہیں۔ اگر حکومت چاہے تو ان علمی کتابوں کے خلاصے جو مصر میں شایع ہوئی ہیں، ہندستان میں بھی رائج کر دے۔

"ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی حکومت کے ساتھ اس باب میں متفق ہیں کہ ہندستان کی سرزمین سے جہالت کی تاریکی کو دور کیا جائے۔ اہلِ ہند کو مغربی علوم و فنون کی برتری کا احساس پیدا ہو گیا ہے شروع شروع میں جب اہلِ ہند سے کہا جاتا تھا کہ وہ سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کریں تو وہ اس کی مخالفت کرتے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے وہ اپنی خوشی سے مغربی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بعض ہندستانی امرا بھی تعلیم کی اشاعت میں ہر طرح مدد دے رہے ہیں اور حکومت ان کی مدد سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ باوجود اس کے اکثر انگریزی حکام کا خیال ہے کہ ہندستانی امرا جو مغربی علوم کی اشاعت میں دل چسپی ظاہر کر رہے ہیں وہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ فی الواقع ان علوم کے

قدردان ہیں بلکہ وہ صرف حکومت کی اس طرح خوش نودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ اس طرح انگریزی حکام مغربی علوم کی برتری اور جدید تعلیم کی برکتوں کو ظاہر کرتے ہیں لیکن یہ بات قرینِ انصاف نہیں معلوم ہوتی کہ ہندستانی امرا کے ذوقِ علمی کو اس طرح خوشامد پر محمول کیا جائے۔ میرے خیال میں ہندستانی امرا جو اس قدر جوش وخروش مغربی تعلیم کی اشاعت کے لیے ظاہر کررہے ہیں اس کی وجہ یہ ہی کہ وہ انھیں مفید سمجھتے اور ان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ ضلع راج شاہی' کے ایک زمیں دار نے ۵ ہزار رُپے سالانہ کی آمدنی کی زمین سرکاری اسکول کے نام وقف کردی ہی بشرطے کہ آیندہ اس مدرسے میں اعلا تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ اس شخص کو اپنے ملک میں اعلا تعلیم پھیلانے کا کس قدر شوق ہی۔[1] میں سمجھتا ہوں مغربی علوم کی اشاعت کا یہ شوق ہندستان میں دن بہ دن ترقی کرتا جائے گا۔ مجھے اس کی بھی پوری توقع ہی کہ ہندستان کے امرا اس وقت مغربی تعلیم کی اشاعت کے لیے جو شوق ظاہر کررہے ہیں وہ آیندہ بھی باقی رہے گا۔

"پنجاب کے باشندوں نے اپنے امرا کی سرکردگی میں قومی علوم کو ترقی دینے کے لیے ایک جامعہ قائم کرلی ہی۔ یہ تسلیم کرنا

---

[1] علی گڑھ اخبار کے مدیر نے اس قسم کی اور بھی مثالیں پیش کی ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں غیر ضروری ہی۔

پڑے گا کہ اس درس گاہ کے قائم ہونے سے نہایت مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ لوگوں میں واقعی اس کی دلی خواہش موجود نہ ہوتی کہ وہ اپنے علوم محفوظ کرنیکا انتظار کریں۔ یہ ایک ننھا سا پودا تھا جو انھوں نے لگایا تھا۔ اب آب یاری اور توجہ سے یہ پودا بڑا درخت ہو گیا ہے اور اس میں پھل پھول آرہے ہیں جن سے ہر شخص بلا امتیاز اس کے کہ وہ امیر ہو یا غریب، مستفیض ہو رہا ہے۔ اس درخت کی تازگی اور سایے میں دلوں کی پژمردگی دور ہوتی ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو اس کا فیضان پنجاب کی حدود سے نکل کر ہندستان کے ہر گوشے تک پہنچے گا۔"[۱]

لاہور کے حلقے میں ۱۳۹۷۲ مسلمان طلبا سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن غیر سرکاری مدارس میں جہاں بغیر حکومت کی امداد سے مذہبی تعلیم کا انتظام ہے اس کی دوگنی تعداد تعلیم پا رہی ہے۔[۲]

۳ نومبر ۱۸۷۱ء کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کی صدارت میں یونی ورسٹی کالج کے طلبا کو انعامات تقسیم کرنے کے لیے لاہور میں ایک بڑا دربار منعقد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا دربار پنجاب میں پہلے کبھی نہیں منعقد ہوا تھا۔ جلسے کی تاریخوں سے پہلے ہی لفٹنٹ گورنر کی دعوت پر پنجاب کے امرا و رؤسا جمع ہو گئے تھے۔

---

[۱] اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار، مورخہ یکم دسمبر ۱۸۷۱ء

[۲] یہ معلومات ڈاکٹر لٹنر کے اس خط سے لی گئی ہیں جو انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔

عورتوں کے لیے نشستیں خاص طور پر محفوظ رکھی گئی تھیں۔ ایک طرف انگریزوں کی نشستیں تھیں اور دوسری طرف ہندستانیوں کی۔ لفٹنٹ گورنر کی نشست سب سے علاحدہ تھی اور اس کے دونوں طرف حکومت کے معتمدین، ڈاکٹر لٹنز اور پنجاب یونی ورسٹی کے چانسلر تھے[۱]۔ ان کے سامنے میزوں پر کتابیں اور دوسری انعامی اشیا بھی رکھی ہوئی تھیں اور جن طلبا کو یہ انعام ملنے والے تھے وہ بھی وہیں نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھیک دس بجے لفٹنٹ گورنر دربار میں داخل ہوا اور اجلاس شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر لٹنز نے گزشتہ سال کی رپوٹ انگریزی زبان میں پڑھی۔ اس کے بعد چندہ ہوا اور تقریباً تین لاکھ روپے کے قریب وعدے ہوئے۔ ہمیں توقع ہے کہ آیندہ سال رقم اس سے زیادہ جمع ہو سکے گی۔ طلبا کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پنجاب کے ہر ضلع سے ہر عمر کے طالبِ علم تعلیم سے مستفید ہونے کے لیے آتے ہیں۔

جب ڈاکٹر لٹنز اپنی رپوٹ پڑھ چکے تو انھوں نے اس کا انگریزی سے ہندستانی میں نہایت فصاحت سے ترجمہ ان لوگوں کے لیے کر دیا جو انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ اس کے بعد لفٹنٹ گورنر نے تقریر کی اور پھر انعامات تقسیم کیے گئے۔ بعض طالبِ علموں کو اتنی کتابیں ملیں کہ وہ اکیلے اٹھا نہیں سکتے تھے۔ جب انعامات تقسیم ہو چکے تو حاضرین میں سے ایک ممتاز

---

[۱] مسٹر پیرسن پہلے راولپنڈی کے ناظرِ مدارس تھے۔ اب وہ لاہور کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونی ورسٹی کے چانسلر ہیں۔ (اخبار انجمنِ پنجاب مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۷۲ء)

شخص نے جس کا نام راجا بہادر منہدی (؟) تھا، ایک باموقع تقریر کی جس میں اہلِ پنجاب کو اس اثر کی مبارک باد دی کہ انھوں نے عام تعلیم کے لیے ایک نہایت مفید ادارہ قائم کر لیا ہے۔ اس کے بعد مسٹر لیپل گریفن Lepel Griffin نے جو معتمدِ حکومت ہیں اور جنھوں نے پنجاب کے راجاؤں کے متعلق ایک اہم کتاب ابھی حال میں شایع کی ہے، تقریر کی اور امید ظاہر کی کہ بہت جلد یونی ورسٹی کام یاب طلبا کو انتہائی اور اعلا ترین امتحانات کی ڈگریاں دینے لگے گی۔ جس روز دربار منعقد ہوا اسی روز لفٹنٹ گورنر کے حکم سے ۱۶ امرائے پنجاب کی ایک مجلس بنا دی گئی ہے جو سنیٹ کے ارکان ہیں تاکہ اعلا تعلیم کی تنظیم کے متعلق غور کیا جائے۔ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے یونی ورسٹی کی ترقی کے لیے جس دل چسپی کا اظہار کیا ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ کام یابی یقینی ہے۔

سنہ ۱۸۶۳ء سے بنارس میں حکومت کی سرپرستی میں ایک کالج قائم ہے جہاں امیروں کی لڑکیاں چاہے وہ یتیم ہوں اور ان کی جائدادوں کا انتظام کورٹ آف وارڈز کرتا ہو اور چاہے اُن کے والدین زندہ ہوں، تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ یہاں صوبۂ شمال مغربی اور بنگال کے امرا کی زیادہ تر لڑکیاں آتی ہیں۔ ان میں ۹ سے لے کر ۱۶ برس کی عمر تک کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انھیں اجازت ہے کہ دو خدمت گار اوپر کے کام کے لیے، ایک باورچی اور ایک سائیس اپنے ساتھ لائیں۔ ہر ایک کو رہنے کے لیے علاحدہ کمرہ

دیا جاتا ہے اور کھانے پکانے کا کمرہ بھی علاحدہ ملتا ہے۔ جہاں سب لڑکیاں پڑھتی ہیں وہ کمرہ مشترک ہوتا ہے۔ طالبات میں رُتبہ اور دولت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ انھیں ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی مطلق اجازت نہیں ہوتی۔ بالخصوص کھانے کے بارے میں ہر ایک کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ جس طرح کا چاہے کھانا پکوائے اور کھائے۔[1]

مسٹر کالن براؤننگ Colin Browning نے اودھ کی ترقیٔ تعلیم پر جو رپوٹ شائع کی ہے، اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس قابل اور روشن خیال ناظمِ تعلیمات کا کرنل نسو لیز Nasson Lees کی طرح یہ خیال ہے کہ مروجہ زبانوں کے ذریعے اہلِ ہند کو تعلیم دینا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ انھیں ادھوری انگریزی کے توسط سے پڑھایا جائے۔ بعض اور دوسرے اعلا انگریزی حکام کا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو انگریزوں کو قدیم رومنوں کے مثل تصوّر کرتے ہیں۔ رومنوں کا دستور تھا کہ جب اپنے سے کم تہذیب یافتہ قوموں کو زیر کرتے تھے تو انھیں اپنی زبان سیکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ لیکن ان صاحبوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اہلِ ہند کی زبانیں انگریزی کے مقابلے میں زیادہ مکمّل ہیں اور ان کی ادبیات نہایت قدیم

[1] ہندستان میں ذاتوں کے لحاظ سے کھانے پینے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کھانا پکانے والا شخص کون ہے اور برتن کس قسم کے استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہیں جس کی قدردانی ہندستان سے زیادہ اس وقت یورپ میں ہورہی ہے۔ رومن لوگوں نے اگر اپنی زبان اور تہذیب مفتوح اقوام پر مسلط کی تو یہ ان کی غلطی تھی۔ رومن جنھیں وحشی خیال کرتے تھے انھوں نے کچھ عرصے بعد جب انھیں موقع ملا رومن اقتدار کو ملیامیٹ کر دیا۔

اودھ میں اُردو شہروں کی اور ہندی دیہاتوں کی زبان ہے۔ عام طور پر اُردو کے ذریعے سے یہاں تعلیم دی جاتی ہے۔ لوگ اس تعلیم سے بالکل مطمئن ہیں۔ اودھ میں اُردو اور فارسی کی بہ نسبت ہندی اور سنسکرت کی زیادہ ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ یہاں اُردو کو جو ترجیح حاصل ہے اس کا اس سے اظہار ہوتا ہے کہ سرکاری مدارس کے کُل طلبا میں سے ۱۷ ہزار ۶۹ طلبا اُردو پڑھتے ہیں اور صرف ۴ ہزار ۹ سو ۲۴ طلبا ہندی پڑھتے ہیں۔

کلکتہ یونیورسٹی نے عام احتجاج سے متاثر ہوکر رعایتاً مڈل کلاس کے امتحان رکھے ہیں جو مروجہ زبان میں ہوتے ہیں یہ امتحان صوبہ جات شمال مغربی، اودھ اور پنجاب میں ہر سال ماہِ اکتوبر میں ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج اب تک قابلِ اطمینان رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے "اینگلو ورناکلر نارمل اسکول" قائم کیے گئے ہیں جن میں انگریزی زبان کی تعلیم اختیاری ہے اور خاص توجہ مروجہ زبانوں کی طرف کی جاتی ہے تاکہ عوام الناس تعلیم سے فیض پائیں۔ "مڈل کلاس" کے امتحان میں ایک مشرقی زبان کے ساتھ انگریزی کا بھی امتحان لیا جاتا ہے۔ انگریزی کی حیثیت

کلاسکی زبانوں کے برابر رکھی گئی ہے۔ میں سر ولیم میور کی رائے سے بالکل متفق ہوں کہ ان مدارس میں ہندُستان کی جدید ادبیات کے فروغ کے لیے کوشش کرنی چاہیے تاکہ مغربی اثر سے اس میں جدید خیالات سموئے جائیں اور وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے ادب کے دوش بہ دوش کھڑی ہو سکے۔

صوبہ جاتِ شمالِ مغربی کی حکومت کی جانب سے ایک مفصّل رپوٹ شایع ہوئی ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں طلبا کی تعداد جو زیرِ تعلیم تھے، دو لاکھ چار ہزار ایک سو تین رہی[1] مدارس کی تعداد ۸۱۱۸ اور کالجوں کی تعداد ۳ تھی۔ طلبا میں گیارہ ہزار دو سو تینتالیس لڑکیاں اور باقی لڑکے تھے۔ گزشتہ سال کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد میں ۵۲۴ کا اضافہ ہوا ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ ان کی تعداد میں دن بہ دن ترقی ہوتی جائے گی۔ سرکاری مدارس میں ۲۶۸ طلبا نے فوقانیہ کے نصاب کی تکمیل کی اور اب وہ یونی ورسٹی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ آٹھ ہزار چھیالیس طلبا نے سرکاری اور غیر سرکاری مدارس میں اُردُو اور انگریزی کی کام یابی کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ صوبہ جاتِ شمال مغربی کے محکمۂ تعلیمات نے سالِ مذکور میں ۱۹ لاکھ ۲۹ ہزار چار سو ۶۹ رُپے خرچ کیے۔

علی گڑھ میں بعض علم دوست حضرات نے عوام کے فائدے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا ہے[2] جس مجلس کے زیرِ نگرانی اس مدرسے

---

[1] اخبار الاخیار۔ مورخہ یکم دسمبر ۱۸۷۱ء

[2] مدرسۂ مفیدِ خلائق (علی گڑھ اخبار۔ مورخہ ۶ فروری ۱۸۷۲ء)

کا قیام عمل میں آیا ہے اس کے معتمد منشی دُرگاہ پرشاد ہیں۔ موصوف ہندُستانی کے عمدہ شاعر ہیں اور شادؔ تخلص کرتے ہیں۔

ضلع کالپی کے ہائی اسکول کی رسم افتتاح ۱ر فروری ۱۸۷۲ء کو لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور کی صدارت میں منائی گئی۔ موصوف نے ۳۰ سال قبل اس ضلع کے نظم و نسق کو درست کیا تھا جلسے میں مجلسِ بلدیہ کے ارکان، ایک نواب اور شہر کے امرا موجود تھے۔ اس جلسے میں فیض علی نے مجلسِ بلدیہ کی طرف سے ہندستانی زبان میں سر ولیم کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا۔ لفٹنٹ گورنر نے اسی زبان میں ایڈریس کا جواب دیا۔ سر ولیم ہندستانی زبان نہایت صفائی اور فصاحت سے بولتے ہیں۔ اس اسکول میں انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا اور اگر بچوں کے والدین چاہیں تو اپنے بچوں کو ان مضامین کی تعلیم کے لیے داخل کرا سکتے ہیں۔ ایک علاحدہ عمارت میں طلبا کی رہائش کا بھی انتظام کیا جائے گا جو ہندستان میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے[۱]

یکم اپریل ۱۸۷۲ء کو الہ آباد کالج کے کھلنے پر جس کے بانی خود سر ولیم میور ہیں اور یہ کالج انھی کے نام پر "میور سنٹرل کالج" کہلاتا ہے، سر ولیم نے ہندستانی زبان میں تقریر کی جس میں طلبا کو نصیحت کی کہ وہ اپنی تعلیم میں جوش اور انہماک سے کام لیں۔ موصوف نے تعلیمِ نسواں کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ

---

[۱] علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۷۲ء

کیا اور بتایا کہ ہندستان کی معاشری ترقی بغیر اس کے ممکن نہیں۔ الہ آباد میں جو بنگالی لوگ آباد ہو گئے ہیں ان کی تعریف کی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلاتے ہیں۔ موصوف نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ صوبہ جاتِ شمال مغربی میں مجموعی طور پر تعلیمِ نسواں نے ترقی نہیں کی۔[1] مسٹر ولیم میور کی تقریرِ دل پزیر میں مشرقی تشبیہیں اور استعارے بلا تکلف استعمال کیے گئے تھے جن کا دیسی لوگوں پر جنھوں نے یہ تقریر سنی، ضرور اثر ہوا ہوگا۔

صوبۂ بمبئی کا محکمۂ تعلیمات قابلِ اطمینان طور پر کام کر رہا ہے۔ اس صوبے کے ناظمِ تعلیمات مسٹر پیل Peile نے جو سالانہ رپوٹ پیش کی ہے اس سے اس صوبے کی تعلیمی ترقی کی تفصیلات کا پتا چلتا ہے۔ یہ رپوٹ ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ صوبۂ بمبئی میں ہندستانی کے دس مدرسے ہیں اور مرہٹی مدارس میں چار مقامات پر ہندستانی زبان کی جماعتوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ جن میں تقریباً ۷۰۰ طلبا ہندستانی پڑھتے ہیں۔ پونا کے نارمل اسکول میں بھی ہندستانی زبان کی علاحدہ جماعت کھول دی گئی ہے جس میں گیارہ طالبِ علم شریک ہیں۔ خاندیس میں ہندستانی کی تعلیم کے لیے ۱۸ جماعتیں اور احمدآباد کے ضلع میں ۴ جماعتیں علاحدہ قائم کی گئی ہیں۔[2]

۱۸۷۱ء کے اخیر میں بمبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ فنون میں میٹرک

---

[1] Allen's Indian Mail مورخہ ۴ جون ۱۸۷۲ء

[2] رپوٹ محکمۂ تعلیمات صوبۂ بمبئی بابت ۱۸۷۱ء

کے امتحان میں ۸۰ طلبا شریک ہوئے جن میں سے ۱۴ کام یاب ہوئے۔ ان کام یاب طلبا میں دس ہندو، دو عیسائی، ایک مسلمان اور ایک پارسی تھے۔ ملکی زبان کے امتحان میں ۱۳۴ امید وار شریک ہوئے جن میں سے ۳۲ کام یاب ہوئے۔ سول انجنیرنگ کے امتحان میں ۱۲ کام یاب ہوئے جن میں ۹ ہندو اور ۳ پارسی تھے[1]۔

لاہور کے ماہ وار رسالے "اتالیقِ پنجاب" میں صوبہ جاتِ متوسط کے صدر مہتمم تعلیمات مسٹر ولموٹ کی رپوٹ بابت ۱۸۷۱ء شایع ہوتی ہے۔ یہ پہلی رپوٹ ہے جو مسٹر ولموٹ نے حکومت کے سامنے پیش کی ہے۔ موصوف نے رپوٹ میں شکایت کی ہے کہ بعض ناظرِ مدارس جب دورے پر جاتے ہیں تو اپنے فرائض کو کما حقہٗ پورا نہیں کرتے۔ یہ دورے گویا ان کے لیے سیر تفریح کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ ایسی مثالیں ہمیں یورپ میں بھی ملیں گی۔ موصوف نے بعض مدرسین کے طریقۂ تعلیم کی بھی شکایت کی ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ نارمل اسکولوں میں صرف ان نوجوانوں کو شریک کرنا چاہیے جو تعلیم و تعلّم سے خاص لگاؤ رکھتے ہوں اور صحیح معنوں میں تحصیلِ علم کے جویا ہوں نہ کہ توتے کی طرح عبارتوں کو یاد کرنے کے خوگر ہوں۔ اس رپورٹ کو پڑھنے سے آدمی محسوس کرتا ہے مسٹر ولموٹ اپنے فرضِ منصبی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھی اور ماتحت افسر بھی انھی کی طرح فرض شناسی سے کام کریں۔

---

[1] Allen's Indian Mail مورخہ ۹ جنوری ۱۸۷۲ء

اہلِ ہند اور یورپینوں کے باہم ملنے جُلنے سے ہندستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں علمی اور ادبی انجمنیں قائم ہوگئی ہیں اور ان میں سے بعض نے خاص اہمیت حاصل کرلی ہے[1]۔ میں لاہور، علی گڑھ، لکھنؤ، مرزاپور اور کلکتہ کی انجمنوں کے متعلق پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ لاہور کی انجمن کے متعلق پنڈت شیوناتھ رائین معتمد انجمنِ تہذیب لکھنؤ نے جو اس کے خاص جلسے میں شریک ہوئے تھے، مندرجۂ ذیل رائے ظاہر کی ہے:۔ "اس انجمن کی مساعی سے بعض نہایت اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے سے ترقی کی بہت سی راہیں کھُل گئی ہیں۔ یہ انجمن دوسری انجمنوں کے لیے بطورِ نمونہ ہے۔ اگرچہ اس انجمن کے پیشِ نظر خالص علمی مقاصد ہیں لیکن وہ اقتصادی اور معاشرتی مسائل سے بھی دل چسپی رکھتی ہے اور ان کے متعلق اپنی رائے سے کھُلم کھُلا حکومتِ ہند اور حکومتِ پنجاب کو مطلع کرتی رہتی ہے۔ یہ انجمن خاص طور پر محکمۂ تعلیمات کو تعلیمِ عامہ کے متعلق اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہتی ہے۔"

انجمن لاہور ہر قسم کے مسائل کے متعلق معلوم ہوتا ہے، اپنی

---

[1] ان انجمنوں میں راج کوٹ کی انجمن قابلِ ذکر ہے جو کاٹھیاواڑ کے امرا نے قائم کی ہے۔ حاجی پور میں مراد علی نے ایک انجمن قائم کی ہے جس کا نام "انجمن تہذیبِ اخلاق" ہے۔ مراد علی بڑے جوشیلے مسلمان ہیں اور اصلاحی کاموں میں بہت حصہ لیتے ہیں۔ ایک انجمن چندر گڑھ میں قائم ہوئی ہے۔ اس انجمن کے زیرِ انتظام پنڈت گوپی ناتھ نے سائنس کے فوائد پر ابھی حال میں تقریر کی تھی۔

رائے کا اظہار کرتی ہے۔ مثلاً جالندھر کے مددگار سپرڈنٹ سید ہادی حسین نے انجمن سے دریافت کیا ہے کہ وہ اپنے خطبات کو جو انھیں حکومت نے عطا کیے ہیں، نام کے ساتھ کس طرح لکھا کریں چنانچہ انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر نام کے شروع میں پہلے سے خان موجود نہ ہو تو "خان" کے خطاب کو نام کے بعد میں رکھا جائے اور "بہادر" اس کے بعد آئے۔ اور اگر خان پہلے سے نام کے شروع میں موجود ہو تو نام کے آخر میں "بہادر" لکھنا کافی ہوگا۔ "رائے" کا خطاب ہمیشہ نام کے شروع میں آنا چاہیے۔

انجمنِ لاہور کے صدر ڈاکٹر لیٹنر نے گزشتہ جلسے میں اعلان کیا کہ چوں کہ وہ راولپنڈی اور گجرات کے حلقے کے مہتمم تعلیمات مقرر ہوئے ہیں اور ان کی جگہ مسٹر پیرسن مقرر کیے گئے ہیں اس لیے مناسب ہوگا اگر ثانی الذکر کو انجمن کا صدر مقرر کیا جائے۔ اگرچہ ارکانِ انجمن اور معتمدین کو ڈاکٹر لیٹنر کی جدائی کا افسوس تھا لیکن انھوں نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ ڈاکٹر لیٹنر نے جو انجمن کی خدمت کی ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ انجمن صاحب موصوف کو ہمیشہ اپنا ہم درد اور بہی خواہ سمجھے گی۔ ڈاکٹر لیٹنر اپنے علم و فضل کے ساتھ اہلِ ہند کی ہم دردی کے لیے بجا طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ ممدوح نے راولپنڈی میں جیسا کہ بعد کی اطلاعوں سے معلوم ہوتا ہے، اپنا کام جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا ہے اور لوگ ان کے کام سے بہت مطمئن ہیں[1]

[1] اخبار انجمنِ پنجاب مورخہ ۲ جولائی ۱۸۷۲ء، علی گڑھ اخبار مورخہ ۲ فروری ۱۸۷۲ء

علی گڑھ سوسائٹی نے اپنے گزشتہ اجلاس مورخہ ۴ مارچ ۱۸۷۲ء کو اُن تصانیف کے متعلق فیصلہ کیا جو ناظمِ تعلیمات کی طرف سے انعامات کے تعین کے لیے اس کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ یہ انجمن لاہور کی انجمن کی طرح برابر کام کیے جا رہی ہے اور اس کا دلچسپ اخبار بہ دستور نکل رہا ہے۔ تمام تصانیف پر غور کرنے کے بعد مولوی رحیم بخش کی تصنیف "حدیقۂ وصال" کو اول انعام کے لائق سمجھا گیا۔ اس کے علاوہ چھ اور دوسری تصانیف بھی انعام کے قابل سمجھی گئیں۔

"علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کی شاخ کا ایک جلسہ ۱۰ فروری ۱۸۷۲ء کو "سائنٹفک سوسائٹی" کے ہال میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں ایسوسی ایشن مذکور کے ارکان کے علاوہ "سائنٹفک سوسائٹی" اور "ریفارم لیگ" کے ارکان نے اور شہر کے امرا نے شرکت کی۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ برہمو سماج کے قائدین اور بعض انجمنوں کے اصرار پر حکومت نے سول شادی (میرج) کی موافقت میں جو مسودۂ قانون پیش کیا ہے وہ کس حد تک قابلِ قبول ہے۔ حکومت کے مسودۂ قانون کو عام طور پر ہندستانیوں نے بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھا اور بعض برہمو سماج کے حامیوں کو بھی وہ پسند نہیں ہے "علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے ایک جلسے منعقدہ ۲۴ فروری ۱۸۷۲ء میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ وائس رائے گورنر جنرل سے ایک معروضے کے ذریعے استدعا کی جائے کہ وہ اس مسودۂ قانون کی ان دفعات کو منسوخ کر دے جو ایسوسی ایشن کے ارکان کے

نزدیک سیاسی، اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے قابلِ اعتراض ہیں۔ یہ واضح رہے کہ ایسوسی ایشن کے ارکان میں ہندؤ اور مسلمان دونوں شریک ہیں۔ یہ جلسہ بدری پرشاد کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ راجا جے کشن داس معتمد اور بعض دوسرے ارکان نے اس موقع پر تقاریر کی تھیں اور اپنے نقطۂ نظر سے ان خطرات کو واضح کیا تھا جو اس مسودۂ قانون کے منظور ہونے سے پیدا ہوں گے۔ اس ضمن میں جو بحث ہوئی وہ حد درجہ دل چسپ ہے۔ اس کی تفصیل "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۸ مارچ میں ۱۵ کالموں میں درج ہے۔ بالآخر جلسے میں جو قرارداد منظور کی گئی اس کی نقل وائس رائے کو بھیج دی گئی[1] لیکن مجلسِ وضعِ قوانین میں مسودۂ قانون منظور کر لیا گیا۔ اب تک یہ قانون نافذ نہیں ہوا ہے اس لیے کہ انڈیا آفس کی منظوری کا انتظار ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈیوک آف آرگل جو آج کل وزیرِ ہند ہیں، ابھی تھوڑے دن گزرنے دیں گے تاکہ اس قانون کے خلاف جو احتجاج ہو رہا ہے وہ کم ہو اور پھر اس کے بعد اسے نافذ کیا جائے۔

مدراس میں دو سو ہندوؤں کا ایک جلسہ ۲۳ اپریل کو منعقد ہوا جس میں مذکورہ بالا قانون کے متعلق اظہارِ ناخوشی کیا گیا۔ جلسے نے اس قانون کے نافذ ہونے کے خلاف جو قرارداد منظور کی اس کا خلاصہ وزیرِ ہند کو بہ ذریعۂ تار روانہ کر دیا گیا اور اس

---

[1] اس قرارداد کی نقل "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۷۰ء میں شایع ہوئی ہے۔

سے درخواست کی گئی ہے کہ پوری قرار داد کے پہنچنے تک وہ کوئی قطعی تصفیہ نہ کرے۔[1]

بٹالہ (پنجاب) میں ایک ادبی انجمن لاہور اور علی گڑھ کی انجمن کے طرز پر قائم کی گئی ہے۔ اس انجمن کا ایک اخبار بھی نکلتا ہے جس کے مدیر بخشی سہارے ہیں۔ جو انجمن کے معتمد بھی ہیں۔ اس قسم کی ایک انجمن جس کے پیشِ نظر ادبی اور معاشری ترقی ہے گونڈہ (اودھ) میں قائم ہوتی ہے۔ اس کے لیے ۴ ہزار ۸۶ رُپے بہ طورِ چندہ جمع ہو گئے ہیں۔

علی گڑھ کی "انجمنِ تہذیب" سائنٹفک سوسائٹی سے مختلف ہے۔ اس کا علاحدہ اخبار بہ دستور جاری ہے۔ ان دونوں انجمنوں کے بانی سیّد احمد خاں ہیں۔

بہار کی سائنٹفک سوسائٹی کا ایک عام جلسہ گزشتہ فروری میں مظفر پوٗر میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں تقریباً دو ہزار اشخاص نے شرکت کی۔ اس انجمن کی جانب سے جو مدرسہ قائم ہے، اس کے طلبا کو پہلے انعامات تقسیم کیے گئے۔ اس کے بعد انجمن کے معتمد مولوی امداد علی خاں نے اپنے ایک مختصر اور برجستہ خطبے میں ان تمام کارروائیوں کا ذکر کیا جو انجمن کے زیرِ انصرام سرانجام پائیں اور جو انجمن کے مقاصد میں شامل تھیں۔ یہ خطبہ نہایت سلیس زبان میں تھا۔ مولوی امداد علی خاں کا مظفر پوٗر میں یہ آخری خطبہ تھا اس لیے کہ بعد میں ان کا تبادلہ گیا ہو گیا، ہمدرد ح

---

[1] Allen's Indian Mal مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۶۲ء

نے 'صاحب گنج' میں مظفر پور والی انجمن کی ایک شاخ قائم کی جس کے دستور کی تفصیل "اخبار الاخیار" میں شایع ہو چکی ہے۔

مولوی امداد علی خاں ۔ نے مظفر پور کی سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے جو خطبہ پڑھا اس میں پابندِ مذہب مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ اہلِ یورپ کے سائنٹفک علوم کو ہندستانی یا کسی اور دیسی زبان میں منتقل کرنے میں کوئی بات مذہب کے خلاف نہیں تصور کرنی چاہیے۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنی چاہیے اس واسطے کہ اس زبان کے ذریعے سے ان کے ہاتھ میں علوم کے خزانے کی کنجی آجائے گی۔ اس کے بعد موصوف نے ان کتابوں کی تفصیل بیان کی جن کے ترجمے ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں۔ پھر ان مدرسوں کا ذکر کیا جو انجمن کے زیرِ انصرام قائم کیے گئے ہیں اور ان طلبا کا حال بیان کیا جنھوں نے کامیابی حاصل کی اور کلکتہ یونی ورسٹی میں شریک ہوئے اور انگریزی کے امتحانات میں ممتاز رہے۔ آخر میں انجمن کی آمدنی اور اخراجات کے گوشوارے پیش کیے گئے[1]

نینی تال کا انسٹی ٹیوٹ اپنا کام خوب اچھی طرح کر رہا ہے۔ اس کے پیشِ نظر خاص کر زراعت کی ترقی کے لیے وسائل اختیار کرنا ہے۔ ہندستان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ زراعت ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایسے مدارس قائم کیے جا رہے ہیں جہاں زراعت کے اصول سکھائے جائیں تاکہ ملک کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہو[2]

---

[1] اخبار انجمنِ پنجاب، مورخہ یکم مارچ ۱۸۷۲ء

[2] علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۶ جنوری ۱۸۷۲ء

"پنجاب ریفارم ایسوسی ایشن" کا مرکز بھی لاہور ہی۔ یہ انجمن بھی اچھی طرح سے چل رہی ہی۔[1]

"اسلامک سوسائٹی" کا سالانہ جلسہ گزشتہ جنوری میں منعقد ہوا۔ اس میں شاہِ سیام، وائس رائے ہند اور متعدد امرا اور انگریز حکام نے شرکت کی۔ مولوی عبداللطیف خاں معتمد اسلامک سوسائٹی نے جو انتظامات کیے ان کی وجہ سے اس جلسے کی بہت شہرت ہوئی۔[2]

کلکتہ کے اسلامیہ کالج کی انجمنِ مباحثہ کا چھٹا سالانہ جلسہ گزشتہ اگست کی ۳ تاریخ کو منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر بلوخ مان Blochman نے کی۔ سالانہ رپورٹ پڑھے جانے کے بعد ریورنڈ ڈاکٹر مرے مچل نے رسول اکرمؐ کے بعد سے اس وقت تک کی اسلامی تاریخ پر تبصرہ کیا اور خاص طور پر مسلمانانِ ہند کی موجودہ حالت کو اجاگر کر کے بتایا۔ اس کے بعد اصولِ اسلام کے متعلق بحث شروع ہوئی۔ ایک نوجوان مقرر نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن میں جنت کا ذکر بہ طورِ تمثیل ہی۔ جس طرح عیسائیوں کو مرنے کے بعد روحانی خوشیوں کا وعدہ کیا گیا ہی اس طرح جنت کی لذتیں روحانی ہوں گی نہ کہ مادّی۔[3]

نیشنل ایسوسی ایشن کی ایک نئی شاخ لیڈز Leeds میں

---

[1] اخبار انجمنِ پنجاب مورخہ ۱۶ اگست ۱۸۷۲ء

[2] علی گڑھ اخبار مورخہ ۴ اکتوبر ۱۸۷۲ء

[3] The Friends of Indian مورخہ ۸ اگست ۱۸۷۲ء

قائم ہوئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ ہند کی معاشری ترقی کی تدابیر اختیار کرے۔ اس کی بانی مس کارپنٹر ہیں جن سے مجھے اُس وقت شرفِ ملاقات حاصل ہوا جب کہ موصوفہ بمبئی جاتے ہوئے پیرس سے گزری تھیں۔ اس ایسوسی ایشن کی شاخیں پہلے سے لندن، برسٹل برمنگھم، منچسٹر، اڈنبرا، گلاسگو اور شفیلڈ میں موجود ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ انگلستان کے اور دوسرے شہروں میں بھی اس کی شاخیں قائم ہو جائیں گی۔ لیڈز کی شاخ ریورنڈ جے۔ ای کارپنٹر کی سربراہی میں نہایت مفید کام کر رہی ہے۔ اس کا تعلق علی گڑھ کے سائنٹفک انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ قائم ہو گیا ہے۔

ہندستان کے موجودہ حالات میں علمی ادبی انجمنوں کو اتنی اہمیت نہیں حاصل ہے جتنی کہ اصلاحِ معاشرت کی انجمنوں کو ہے جو ایک طرح سے مذہب سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے برہمو سماج کو ہمیں خاص اہمیت دینی چاہیے۔ اس سال ۱۴ فروری چہار شنبہ کے روز بابو کیشب چندر سین نے کلکتہ میں اپنا سالانہ خطبہ پڑھا۔ جس جلسے میں یہ خطبہ پڑھا گیا اس میں ہزاروں اشخاص شریک تھے جن میں انگریز بھی کافی تعداد میں تھے۔ "اخبار انجمنِ پنجاب" کے مدیر نے اپنے اخبار کی ۱۶ فروری کی اشاعت میں اس ضمن میں لکھا ہے کہ "ان کے (کیشب چندر سین کے) خطبے اس قدر دل پزیر ہوتے ہیں اور وہ اپنے دلائل سے اس قدر اچھا اثر پیدا کرتے ہیں کہ ان کی تقریر سننے والا ان کے عقائد کی برتری کا قائل ہو جاتا ہے اور ان کی شخصیت کی عظمت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ جاتا ہے۔

ان کی ذات سارے ہندستان اور خاص طور پر بنگال کے لیے مایۂ صد افتخار ہی۔ ان کے عقائد میں یہ بات قابلِ لحاظ ہی کہ وہ ذات پات کو بالکل مٹانے کے موید نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہی کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہندو جاتی دَرہم بَرہم ہو جاتے گی۔ کیشب چندر سین کا خیال ہی کہ ذات پات کی بدولت عوام کے اخلاق اور ہندو امارت کا قیام ممکن ہوا۔ ہم نے یہ کہتے سنا ہی کہ برہمو سماجی اپنے طور پر خدا کی وحدانیت میں یقین رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سارے ہندستان میں خدا کی وحدانیت کو تسلیم کیا جاتے۔ لیکن وہ ہندو سماج کو مٹانا نہیں چاہتے بلکہ نئی بنیادوں پر اس کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ کنٹربری کے اسقفِ اعظم اور ریورنڈ ڈاکٹر ٹیٹ (TAIT) نے ٹھیک کہا کہ برہمو سماج ہندو دھرم سے بھی زیادہ بُت پرستی کی طرف لے جانے والی تحریک ہی[1]

"برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کو برہمو سماج کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ یہ انجمن بُت پرستی کی بالکل مخالف تو نہیں ہی۔ ہاں، اس کے ارکان یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کے مندروں میں جس بے حیائی اور عُریانی کا مظاہرہ ہوتا ہی، اس کو روکا جاتے۔ اس انجمن کے ایک اجلاس میں جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا، بابو راجندر لال متر نے جو مشہور عالم اور ماہر آثارِ قدیمہ ہیں، اس قسم کی تجاویز کی مخالفت کی اس لیے کہ اگر ہندو دھرم کی خارجی نشانیوں کو مٹا دیا گیا تو خود ہندو دھرم مٹ جاتے گا اور عوام کے مذہب کو

[1] یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہی (مترجم) اس سلسلے میں ملاحظہ ہو لندن ٹائمز کا خط جو ۲ ستمبر ۱۸۲۳ء کو شایع ہوا۔

سخت ٹھیس لگے گی۔ ہمیں انگریزی حکومت کی اس باب میں تقلید کرنی چاہیے جس نے مذہب کی پوری آزادی دے رکھی ہے۔ اگر عوام کے معاملات میں دخل اندازی کا یہی حال رہا تو کل یہ کہا جائے گا کہ فقیر سنیاسی ننگے نہ پھریں اور بچے بھی گھر سے باہر نکلیں تو اسی طرح کپڑے پہنے ہوئے ہوں جس طرح یورپ میں ہوتے ہیں۔ انگریزی حکومت نے اس معاملے میں اہلِ ہند کو پوری آزادی دے رکھی ہے۔ وہ اس وقت تک دخل اندازی نہیں کرتی جب تک کہ کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جو فطری قانون کے بالکل ہی خلاف ہو۔ اس ضمن میں میں "نسیم جون پور" کا ایک اقتباس اس جگہ نقل کرتا ہوں: "ابھی حال ہی میں بنارس میں ایک فقیر ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا کہ نہ وہ ہلتا ہے، نہ حرکت کرتا ہے۔ لوگوں کو اس سے عقیدت پیدا ہوئی اور ایک رسّی کے ذریعے سے جو درخت پر باندھ دی گئی تھی، اسے کھانے پینے کی چیزیں اوپر چڑھانے لگے"۔[۵] انگریزی حکومت اس قسم کے فقیروں کو جو ان کا جی چاہے کرنے دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے یورپ میں بھی بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جنھیں دانش مند لوگ معیوب سمجھتے ہیں لیکن حکومتیں انھیں منع نہیں کرتیں۔

برہمو سماج کی سب سے قدیم شاخ "ادھی سماج" ہے۔ یہ اپنے مخصوص انداز میں ہندو دھرم کی تاویل پیش کرتی ہے۔ کلکتہ کی نیشنل سوسائٹی کے ایک جلسے میں اس شاخ کے ایک سرگرم

---

۵ یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہے (مترجم)

رُکن بابو راج نارائن بوس نے "ادی سماج" کے اصول پر تقریر کی۔ موصوف نے بارہ دلائل پیش کیے جن کی بنا پر ہندو دھرم کی دنیا کے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ان دلائل میں سے بعض ایسے ہیں جنھیں سن کر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بابو صاحب کو دوسرے مذاہب کا علم بہت کم ہے۔ بابو صاحب کے دلائل یہ ہیں:۔ (۱) ہندو دھرم کسی ایک شخص کے نام کے ساتھ وابستہ نہیں ہے جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے۔ اس لیے یہ بہ نسبت دوسرے مذاہب کے زیادہ عالم گیر مذہب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے (۲) ہندو دھرم میں پرستش کرنے والے اور جس شی کی پرستش کی جائے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ہندو براہِ راست شیو، وشنو یا دُرگا کی پوجا کرتے ہیں اور انھیں اپنا معبودِ حقیقی سمجھتے ہیں۔ (۳) ہندو دھرم میں خدا اصل روح ہے جو انسان کی ذات سے بالکل قریب ہے اور انسان اس کے نزدیک محبوب ہے۔ اپنشدوں کے زمانے سے لے کر آج تک ہندو دھرم میں یہ تخیلات ملیں گے۔ (۴) انسان باوجود اپنی دنیاوی زندگی کے خدا کی ذات میں ضم ہو سکتا ہے۔ (۵) دوسرے مذاہب میں نیکی کی تعلیم کے عوض ابدی مسرت کے وعدے کیے گئے ہیں حالاں کہ ہندو دھرم میں نیکی کی خاطر اور خدا کی پرستش خدا کی خاطر کی جاتی ہے۔ (۶) دوسرے مذاہب میں صرف انسانوں پر رحم کرنے کا حکم ہے حالاں کہ ہندو دھرم میں تمام زندہ مخلوق کے ساتھ رحم کرنے کا حکم ہے۔ (۷) ہندو دھرم میں آخرت کا جو تصوّر پیش کیا گیا ہے وہ اس سے اعلا ہے جو دوسرے مذاہب میں پیش کیا گیا ہے۔ ہندو دھرم میں تناسخ کے ذریعے گناہوں کا

کفارہ ہونا ہے حالاں کہ مسیحیت اور اسلام میں جو جہنم میں جائے گا وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ آخرت کی زندگی کا جو تصور ہندو دھرم میں ہے وہ انسان کی اس ترقی کا ضامن ہے جو وہ دنیا میں کر سکتا ہے۔ (۸) ہندو دھرم دوسرے مذہبوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتا اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کی پیروی کر کے نجات حاصل کر سکتا ہے (۹) ہندو دھرم میں ایسے عقائد بھی قابلِ قبول ہیں جو ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جن کی ذہنی تربیت کافی طور پر نہیں ہوئی ہے۔ بیش تر اس کے کہ وہ اعلا عقائد تک پہنچیں انھیں ادنا درجے کے عقائد کی منزل سے گزرنا ضرور ہے، یہاں تک کہ آخر میں ہر شخص ذاتِ الوہیت کا جز بن سکتا ہے۔ (۱۰) ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ مذہب زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے چناں چہ یہ کہنا درست ہوگا کہ "ہندو کا کھانا، پینا، رہنا سہنا اور سونا مذہب کے مطابق ہوا کرتا ہے"۔ (۱۱) ہندو دھرم کے مطابق سائنس، سول دستور اور معیشت کے ہر مسئلے کی توجیہہ ممکن ہے اس لیے کہ وہ مذہب کے اثر کو زندگی کے ہر گوشے پر مسلط کر دیتا ہے۔ (۱۲) ہندو دھرم انسان کا قدیم ترین مذہب ہے۔ وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مذہب فطرتِ انسانی کی مستقل بنیادوں پر قائم ہے۔"[1]

کوکا لوگوں نے جو علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے اس کی وجہ سے پبلک اس فرقے کے معاملات میں دل چسپی لے رہی ہے۔ اس فرقے کے بعض افراد پر جو مظالم کیے گئے ہیں اور ان کو طرح طرح سے جو اذیتیں

---

[1] Allen's Indian Mail مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۸۹۲ء

دی گئی ہیں، اس کے خلاف حکومت کارروائی کر رہی ہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فرقے کے متعلق یہاں کچھ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

بابو کاشی ناتھ نے "علی گڑھ اخبار" مورخہ ۳ مئی ۱۸۷۲ء میں اس فرقے کے متعلق جو کچھ لکھا اُس کی معلومات کا ماخذ ایک جوگی ہی۔ وہ لکھتے ہیں :۔ "یہ فرقہ صرف چھ سات سال ہوئے وجود میں آیا ہی۔ اس کے بانی کا نام گرو رام سنگھ ہی جو آج کل الہ آباد میں قید ہی۔ گرو رام سنگھ کے پیرو 'کوکا' اس لیے کہلاتے ہیں کہ یہ اپنی عبادت میں 'کوک' کا لفظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ اس فرقے میں زیادہ تر بڑھئی، لوہار اور معمار لوگ شامل ہیں جو پنجاب کے جنوب مغرب میں آباد ہیں۔ اس پر تعجب ہوتا ہی کہ ایک ادنا شخص نے اتنے تھوڑے عرصے میں اس قدر اثر پیدا کرلیا ہی اور اچھی خاصی تعداد کو اپنے فرقے میں داخل کرلیا ہی۔ حالاں کہ مسیحی مبلّغین کو باوجود انتہائی مشقت کے نسبتاً بہت کم کامیابی حاصل ہوئی ہی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ انسان نیکی کے مقابلے میں بدی کی جانب جلد راغب ہو جاتا ہی۔ 'کوکا' لوگ دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ وہ سکھوں کے بھی دوست نہیں ہیں اگرچہ گرو گوبند سنگھ کو وہ مانتے ہیں اور گرنتھ کو مقدس کتاب سمجھتے ہیں۔ چناں چہ امرت سر کے بڑے مندر کے نگہبان 'کوکا' لوگوں کو اندر نہیں جانے دیتے۔ اس لیے کہ 'کوکا' لوگوں نے نہ صرف مساجد کو بلکہ بعض جگہ دھرم شالوں اور گئوڈوں کو بھی مسمار کر ڈالا ہی۔ انھیں پورا یقین ہی کہ ان کا فرقہ کچھ عرصے بعد سارے ہندستان

میں حاوی ہو جائے گا اور دوسرے مذاہب پر اسے فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ کوکا، لوگوں میں ذات پات کی تقسیم نہیں ہوتی۔ نہ وہ برہمنوں کی عزت کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی مقدس جاتراؤں، دریاؤں، سنگموں اور گئو ماتا کا ان کے نزدیک احترام ضروری نہیں ہے۔ گرونانک نے اپنی تعلیم میں ہندو دھرم کے جو تھوڑے بہت عناصر باقی رکھے تھے، انھیں بھی کوکا فرقے نے نکال پھینکا۔ چناں چہ اس بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ سکھوں سے علاحدہ ہیں۔ لیکن ان میں اور سکھوں میں سلام کا طریقہ ایک ہی ہے یعنی دونوں "اکال پرش" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

"کوکا لوگ عام طور پر مہمان نواز ہوتے ہیں اور آپس میں مل جل کر محبت سے رہتے سہتے ہیں۔ ان میں بغاوت کی آگ مشتعل کرنے والے چند ڈاکو ہیں جو بد امنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس فرقے کے اکثر لوگ امن پسند پیشہ ور ہیں جو بغاوت کو پسند نہیں کرتے۔ ۴۹ باغیوں کو بغیر عدالتی کارروائی کے جو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس سے نہ صرف اس فرقے کے افراد میں بلکہ سارے ہندستان میں سنسنی پھیل گئی ہے۔ کوکا لوگوں کی عادات سادہ ہوتی ہیں۔ ہندوؤں کی طرح بچوں کے پیدا ہونے اور شادی اور موت کے موقع پر بھی یہ رسوم کی پابندی نہیں کرتے۔ ان رسوم کے لیے کوئی خاندانی پروہت نہیں طلب کیا جاتا جو شاستروں کے مطابق رسوم بجالائے۔ کوکا لوگ اپنے مُردوں کے متعلق بھی کوئی مقرر قاعدے نہیں رکھتے۔ ان میں سے بعض اپنے مُردوں کو مسلمانوں کی طرح دفن کرتے ہیں،

بعض ہندوؤں کی طرح جلاتے اور بعض پارسیوں کی طرح ہوا اور دھوپ میں چھوڑ دیتے ہیں"[1]

سب سے پہلے علماے دینیات نے یورپ میں مشرقی سامی زبانوں کی تحقیق کی طرف توجہ کی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح انجیلِ مقدس کے خاص خاص محاوروں اور ان رسوم وروایات کا پتا لگایا جائے جن کی نسبت اس میں ذکر ملتا ہی۔ چوں کہ یہ رسوم یورپ کے رواجوں سے بالکل مختلف ہیں اس لیے سامی زبانوں کا کھوج لگایا گیا تاکہ ان کی اہمیت واضح ہو سکے۔ بہ نسبت کیتھولکوں کے پروٹسٹنٹوں نے مشرقی زبانوں کی تحقیق میں زیادہ کام کیا اس لیے ان کے عقائد تمام تر انجیل مقدس ہی پر مبنی تھے۔ چناں چہ مشرقی زبانوں کے متعلق انگلستان، ہالینڈ، جرمنی، ناروے اور سویڈن میں بہ نسبت فرانس کے زیادہ کام کیا گیا۔ مشرقی زبانوں کی تحقیق سے انجیلِ مقدس کے سمجھنے میں جو مدد ملی ہی اُسے ریورنڈ جیمز لانگ[2] James Long نے تسلیم کیا ہی۔! موصوف نے اپنی تصنیف میں ان استعاروں کا ذکر کیا ہی جو انجیل میں ملتے ہیں اور پھر ان کا مقابلہ ہندستانی (اردو)، عربی، فارسی، بنگالی اور اسی کے محاوروں اور استعاروں سے کیا ہی۔ یہ کتاب اس قدر دل چسپ ہی کہ میں اس کے اکثر حصّوں کو یہاں نقل کر سکتا ہوں لیکن چوں کہ ایسا کرنا طوالت کا باعث ہوگا اس واسطے میں صرف چند مثالوں پر

---

[1] مینیر نے اپنے ۱۸۷۱ء کے مقالے میں بھی ان کے متعلق ضمنی طور پر ذکر کیا تھا۔

[2] ملاحظہ ہو ممدوح کی تصنیف Scriptural Truth in Oriental dress کلکتہ ۱۸۷۱ء

اکتفا کروں گا۔ مصنف نے اس کتاب کے تیار کرنے میں بہت جاں فشانی کی ہی اور تبحّرِ علمی کا ثبوت دیا ہی۔ اور یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ مسیحیت کی خدمت ہو سکے۔

اس کتاب میں بعض ایسی رسوم کی طرف توجہ دلائی گئی ہی جن کے متعلق انجیل میں بھی ذکر ملتا ہی۔ مثلاً انجیل میں "کھاری سمندر" کا ذکر ملتا ہی (ریم ہملح) اسی طرح جیسے عربی میں بحر اور فارسی میں دریا کہتے ہیں۔ اور اگر کھلے سمندر سے مقصد ہوتا ہی تو عربی میں مالح اور فارسی میں شور کا لفظ بڑھا دیا جاتا ہی۔ حضرت موسیٰؑ نے جب مقدس سرزمین پر قدم رکھا تو اپنے جوتے اتار دیے۔ مشرق میں اب بھی یہ دستور موجود ہی کہ مسجد میں لوگ جوتے اتار کر جاتے ہیں۔ عربوں میں "نمک" وفاداری کے خیال کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور انجیل میں بھی یہی خیال اسی محاورے سے ادا کیا گیا ہی۔ انجیل میں اس خیال کو ظاہر کرنے کے لیے کہ "تم مجھے جانتے ہو" یہ محاورہ استعمال کیا گیا ہی۔ "تم میرا بیٹھنا اور اُٹھنا جانتے ہو"۔ فارسی میں بالکل یہی محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ انجیل میں مَطلع صاف ہونے کے لیے یہ محاورہ استعمال ہوا ہے "آسمان کھُل گئے"۔ بالکل یہی محاورہ ہندستانی زبان میں بھی مستعمل ہی۔ انجیل میں ہی کہ "زندگی کا دروازہ چھوٹا ہی اور جو راستہ اُس کو جاتا ہی وہ تنگ ہی"۔ یہی خیال یجروید میں بھی پیش کیا گیا ہی اور مسلمانوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہی کہ جنت کا راستہ پُل صراط پر سے ہی جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہی۔ انجیل میں دو عورتوں کا ذکر ہی جو چکّی میں گیہوں پیس رہی ہیں۔

مشرقی ممالک میں یہ رواج ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور اب بھی موجود ہے۔ مشرق میں چکی میں گیہوں اسی طرح سے پیستے ہیں جیسے ہمارے یہاں قہوہ یا کالی مرچ پیسی جاتی ہے۔ انجیل میں مختلف مقامات پر مذکور ہے کہ حضرت مسیحؑ اور ان کے حواری خانۂ خدا میں جاکر تلقین کرتے تھے۔ لیکن وہ آخر کس طرح تلقین کر سکتے تھے جب کہ انھیں ستانے والے موجود تھے۔ مسلمانوں میں اب بھی یہ طریقہ رائج ہے کہ مسجد ہر ایک کے لیے کھلی ہوتی ہے۔ بغیر رُکاوٹ کے اس میں ہر مسلمان داخل ہو سکتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ حضرت مسیحؑ اور حواریوں نے بھی یہی کیا ہوگا کہ چوں کہ خانۂ خدا میں ہر شخص جاکر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے انھوں نے بھی بلا روک ٹوک اپنی تعلیم کی اس طرح تلقین کی ہوگی۔ انجیل میں ہے کہ خدا کے نیک بندوں کی پیشانی پر خدا کا نام لکھا ہوتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جس طرح ہندوؤں میں ماتھے پر تلک لگاتے ہیں اور اس کے ذریعے مختلف ذاتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ انجیل کے بہت سے محاورے ایسے ہیں جو آج بھی ہندستانی زبان میں بولے جاتے ہیں۔ ہم ان میں سے چند ذیل میں لکھتے ہیں:۔

(۱) خدا جسے بچائے اس کا بال بیکا کرنے والا کون ؟

(۲) اپنا مُنھ آئینے میں دیکھو۔

(۳) کپڑوں کا حُسن الماری میں ہوتا ہے اور آدمی کا ذاتی حُسن اس کی شخصیت سے وابستہ رہتا ہے۔

(۴) دولت ڈھلنے والی چیز ہے جیسے دوپہر کا سورج۔

(۵) نیم کڑوا ہی رہے گا چاہے آب یاری بجائے پانی کے دُودھ ہی سے کیوں نہ ڈالا کرو۔

(۶) درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہی۔

(۷) اگر کانٹے بوؤگے تو گلاب نہیں کاٹوگے۔

(۸) سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی کا گزرنا (انجیل کے محاورے میں بجائے ہاتھی کے اونٹ ہی)

مسیحیت کے مبلّغین جو انجیل کے تمام حصوں پر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں ہندستان کے مختلف مراسم سے بعض ایسے حصّوں کی تشریح کرسکتے ہیں جو اب تک مبہم رہے ہیں اور جنھیں خود سمجھنے کے بعد دوسروں کو بھی سمجھا سکیں گے۔

کولونیل چرچ کرانیکل Colonial Church Chronicle کی مئی کی اشاعت میں لکھا ہی کہ "غیر مسیحی ممالک میں جو لوگ حضرت مسیح کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں ان کی نظر سب سے پہلے ہندستان پر پڑتی ہی جو ان کی دل چسپی کا مرکز ہی۔ اس زبردست سلطنت کے آٹھ صوبوں میں صرف شمال مغربی صوبہ اتنا وسیع ہی جتنا کہ برطانیۂ عظمیٰ۔ اس صوبے کی آبادی ۳ کروڑ سے زائد ہی۔ پنجاب کا رقبہ اٹلی کے برابر ہی۔ صوبہ جات متوسط بھی رقبے میں برطانیۂ عظمیٰ اور آئرلینڈ کے مساوی ہیں۔ باوجود اس قدر وسعت کے اس پورے ملک میں انگلستان کی طرف سے صرف تین اسقف مقرر کیے گئے ہیں حالاں کہ روم کے کلیسا کے ۱۶ اسقف ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ یہ تینوں اسقف نہایت جوشیلے ہیں اور وہ اپنے کاموں سے اپنے اپنے علاقے

میں زندگی پیدا کر رہے ہیں۔[1]

کیتھولک مشن ہندستان میں خوب کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے وسائل نہایت وسیع ہیں مسیحیت کی اشاعت کے لیے صرف فرانس میں ۴۷،۴۸۶۰۲ فرانک کی رقم فراہم کی گئی لیکن یہ رقم دنیا کے مختلف حصوں میں تقسیم کی جائے گی جیسا کہ اسقف ہیبر Heber نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"گرین لینڈ کے برفیلے پہاڑوں سے لے کر ہندستان کے ساحلوں اور افریقہ کے دریاؤں تک جو اپنی سنہری ریت آفتاب کی روشنی میں بہا کر لاتے ہیں وہ (مسیحی مبلغین) غلط رَوِی کی زنجیر سے ملکوں کو رِہا کرتے ہیں۔ ان کی آواز قدیم دریاؤں کے ساحلوں اور کھجور کے درختوں سے بھرے ہوئے میدانوں میں سنائی دیتی ہے۔"

سنہ ۱۸۶۲ء میں جو اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے ان کے مطابق ہندستان میں کیتھولکوں کی تعداد ۸۷،۸۶۹۱ تھی لیکن اسقف ملمین Milman کا خیال ہے کہ ان کی تعداد میں کچھ تخفیف ہو گئی ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:[2]۔ "یسوعیوں کے مدارس نہایت عمدہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کیتھولک مشن کے سرگروہ ہندستان میں اسقف اعظم اسٹینس Steins ہیں جو نہایت فاضل شخص ہیں اور ساتھ ہی ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو کلیسا کے

---

[1] تین اسقف یہ ہیں۔ ڈاکٹر Milman اسقف کلکتہ، اسقف ڈگلس Douglas اسقف بمبئی، اور اسقف گل Gell اسقف مدراس۔

[2] Colonial Church Chronicle بابت جون سنہ ۱۸۶۲ء

ایک اعلا عہدے دار ہیں ہونی چاہییں۔ وہ نہایت خلیق اور صاحبِ وجاہت ہیں اور ان کی شخصیت سے ہر شخص متاثر ہوتا ہی کیتھولک کلیساؤں میں یورپین اور ہندستانی لوگ بلا کسی نسلی امتیاز کے شرکت کرتے ہیں۔ کیتھولک لوگوں میں مذہبی اقتدار کو بلا چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہی اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے خلاف زبان ہلا سکے"۔

مذکورۂ بالا رائے ایک انیگلی کن Anglican اخبار کی ہی جس نے بڑا ہی رعایت کیتھولک مشن کی خدمات کا اعتراف کیا ہی۔ لیکن کیتھولک مشن کو پروٹسٹنٹ مشن سے یہ شکایت ہی کہ خواہ مخواہ اس نے رقابت پیدا کرلی ہی۔ دراصل دونوں مشنوں میں مقابلہ کبھی بھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ اس کا اظہار "سال نامۂ اشاعتِ دین" میں کیا گیا ہی۔

کلکتہ کے اسقف اعظم ملمین نے، جن کے تحت ہندستان اور لنکا کے تمام مسیحی حلقے ہیں، مارچ ۱۸۷۱ء میں اپنے احکام کی دوسری قسط شائع کی ہی۔ پہلی قسط کے متعلق میں اپنے ۱۸۶۸ء کے خطبے میں ذکر کرچکا ہوں۔ ہندستان کے اسقف اعظم نے مذہبی جلسے اپنے سفر کے دوران میں ملک کے ہر حصے میں منعقد کیے۔ موصوف نے اس ضمن میں تذکرہ لکھا ہی کہ جنوبی ہند میں بہ نسبت شمالی ہند کے مسیحیت کے حلقے میں زیادہ تعداد میں لوگ شامل ہوئے۔ جنوبی ہند میں بعض اضلاع میں خاص طور پر مسیحیت کو خوب فروغ حاصل ہوا ہی۔ انیگلی کن کلیسا کے پیرو اس وقت تمام ہندستان میں ۱۸۰۰۰ ہیں۔ اب دن بہ دن ایسے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہی جو اچھے

اور ان کے معجزوں پر جو انھوں نے اپنے ثبوت میں دکھلائے روشنی ڈالے گی۔[1]

اس انجمن کے ممبروں نے جس کا نام بڑی خصوصیت سے برہمو دھرم رکھا گیا ہی، اس سال بڑے جوش سے ایرانیوں کی طرح ایرانی عید نوروز پارسیوں کی طرح مناتی۔ اس تقریب میں جو جلوس کلکتہ میں نکالا گیا اس میں تین جھنڈیاں تھیں جن کو ایک ہندو، ایک مسلمان اور ایک عیسائی اُٹھائے ہوتے تھا، اس جشن کے سلسلے میں پندرہ سو آدمیوں کے رو بہ رو کیشب چندر نے ایک تقریر کی۔[2]

جرنل آف دی نیشنل انڈین اسوسی ایشن[3] Journal of the National Indian Association جو ماہ بہ ماہ شایع ہو رہا ہی، ایک دل چسپ تقریر کا ذکر کرتا ہی جو مسٹر الٹوڈس پری چارڈ Mr. Iltudus Prichard نے سوشل سائنس اسوسی ایشن Social Science Association کے ہال میں ۲۰ دسمبر ۱۸۷۲ء کو انجمن کے قیام (جو ۱۸۷۰ء میں قائم ہوئی) کی یادگار کے سالانہ جلسے میں ہندستان میں تعلیم کے موضوع پر کی۔ اس مشہور و معروف شخص نے پہلے تو National Association کے ارتقا کا ایک خاکہ کھینچا، یہ انجمن ہندستان میں معاشرتی ترقی

---

[1] پنجابی ۲ جولائی ۱۸۷۲ء

[2] پنجابی ۲ فروری ۱۸۷۳ء

[3] شمارہ ۲۵ جنوری ۱۸۷۳ء

کے لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے بعد مقرر نے سامعین سے اس مبحث کا ذکر کیا جس میں ایک فریق عام دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہتا ہے اور دوسرا فریق انگریزی کا حامی ہے۔ اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ عوام النّاس میں تعلیم کی ترویج کے لیے عام دیسی زبان زیادہ کارآمد ثابت ہوگی مگر اعلا طبقوں میں تعلیم کے لیے انگریزی مناسب ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اُردو کا ذکر کیا اس زبان کی آفرینش وارتقا کی تاریخ دہرائی اور زور دیا کہ سائنس اور جدید فلسفے کی اشاعت وترویج کی اس زبان میں خاص صلاحیت ہے کیوں کہ بڑی سہولت سے یہ زبان سنسکرت اور عربی الفاظ کو جذب کرسکتی ہے جو فنی اصطلاحات کے کام آسکتے ہیں۔ اُردو کی اس تعریف میں مشہور عالم ہندستانی میجر اٹلی Major Ottley نے ان کی ہم نوائی کی۔

مسٹر پری چارڈ نے ہندستانیوں کے لیے دیسی ادب کی فراہمی پر زور دیا، ایسا ادب جو بہ یک وقت صحیح الاثر ہو اور جو سستی قیمت پر خریدا جا سکے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۸۷۲ء میں تعلیم کی حد تک ہندستان میں کیا کیا خاص باتیں پیش آئیں۔ بہت ہم دردی کے ساتھ انھوں نے اس تجویز کا ذکر کیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کالج قائم کیا جائے اور حکومتِ مدراس کے اس اقدام کی تعریف کی کہ انھوں نے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو وہ جگہیں دیں جن سے وہ محروم تھے کیوں کہ اس پریسیڈنسی میں اس وقت صرف اُنّیس مسلمان عہدے دار تھے

اور چار سو سترہ ہندو۔ انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ لندن میں
ایک ایسا کالج قائم کیا جائے جس کا تعلق ہندستانی جامعات
سے ہو اور جہاں ہندستانی اپنی تعلیم مکمل کر سکیں اور سول سروس
میں شریک ہو سکیں اور شرکت کے لیے انھیں دقتوں کا سامنا نہ
کرنا پڑے۔

مسٹر پری چارڈ کی تقریر گویا اسوسی ایشن کے نظام العمل
کی تشریح ہے جو ہندستانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں علی گڑھ
اخبار مورخہ ۱۳ جون ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ قرونِ وسطیٰ میں جب کہ کلیسا اس قدر امیر تھا اور پادری
اس قدر کثیر تعداد میں موجود تھے، کلیسا نے مشنری فرائض اپنے
ذمے نہیں لیے۔ اس زمانے میں بجز ژاں دموں کاروال
Jean de-Mont-Crovin کے مشن کے جو چین گیا تھا، کسی کا
ذکر پڑھنے میں نہیں آتا۔ تین سو سال کے بعد لوگوں کے اس قابلِ قدر
کام پر نظر پڑی اور چند سال کے عرصے میں اس نے غیر معمولی
ترقی کی، نہ صرف رومن کیتھولک کلیسا نے اس کی طرف توجہ
کی بلکہ روسی کلیسا، انگلیکن کلیسا اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں نے
بھی اس میں حصہ لیا[1]۔ جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے انگریزی
مشنری اس وقت تک نہیں بھیجے جاتے جب تک وہ اس
ضلع کی زبان میں، یہاں انھیں کام کرنا ہو، ایک سخت امتحان
میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ ۱۸۷۲ء میں چھ سو چھ مشنری تھے

[1] برلن کی مشن نے آٹھ ہزار عیسائی شدہ دیسیوں کا ذکر کیا ہے۔

جو پانسو بائیس مقامات پر کام کر رہے تھے۔

ہندستان میں ۱۸۷۲ء میں ایک ملین رومن کیتھولک عیسائیوں کے علاوہ دوسرے عیسائی فریقوں میں تین ارب اٹھارہ ہزار تین سو ترسٹھ دیسی عیسائی تھے۔

میرے پیشِ نظر ۱۸۷۲ء کے متعلق Punjab Book and Tract Society اور Punjab Auxiliary Bible Society کی سالانہ رُوداد یں ہیں۔ یہ پانچویں رُوداد ہے اور دونوں رُوئدادیں حسبِ سابق ریورنڈ رابرٹ کلارک Rev. Robert Clarke نے مرتب کی ہیں۔ از راہِ مہربانی انھوں نے مجھے ایک نسخہ بھیجا ہے اور اس کے Lahore Divinity School سے متعلق Rev T. Vulpy French کا "سالانہ مراسلہ" Annuel Letter ان رُویدادوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میرے کام کے حلقے میں شامل ہے کیوں کہ ان کا بڑا حصہ دیسی عیسائی ادب کے متعلق ہے جو دِن دُونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مشنری بھی جدید ادب کی ترقی میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور مغربی حالات سے اس کے اسلوب میں ترمیم کر رہے ہیں۔

ان دونوں انجمنوں کا مرکز لاہور ہے۔ یہیں مختلف انجمنوں کی شایع کردہ کتابوں اور رسالوں کا ذخیرہ ہے خصوصاً اُن اُردو اور ہندی کتابوں کا جو انجمن برائے رسالہ جات الہ آباد اور مشن پریس لدھیانہ نے شایع کیے ہیں۔

ریورنڈ مسٹر کلارک کی رپوٹ کا سب سے دل چسپ حصہ وہ ہے

جس میں مختلف مشنریوں اور تازہ عیسائی شدہ دلیسیوں کی مراسلت ہے۔ موخر الذکر میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر عماد الدین[1] ہیں جو بہت سرگرمی سے اس پُرجوش کوشش میں مصروف ہیں کہ اپنے قدیم ہم مذہبوں کو حقیقت کا راستہ دکھائیں۔

بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس قسم کے مذہبی رسالہ جات جو دلیسیوں میں تقسیم کیے جا رہے ہیں، ان سے کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے لیکن جس رپوٹ کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کے معائنے سے اس امر کے کئی ثبوت مل سکتے ہیں کہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔

اُردو کے عیسائی رسالہ جات ہیں جن کی تعداد پچانوے کے قریب ہے اور جن میں سے بعض لاطینی حروف میں ہیں "تاریخِ کلیسا" مُرتبہ سر ولیم میور اور چند نئی تصنیفوں کو خصوصیت سے قابلِ ذکر سمجھتا ہوں لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کتابیں اور رسالہ جات جو حال میں شایع ہوئے ہیں، زیادہ تر ان کتابوں کے نئے اڈیشن ہیں جو پہلے مشن کے پچیس چھاپے خانوں سے شایع ہو چکی ہیں۔

امدادی انجمن برائے اشاعتِ کُتبِ مقدس پنجاب کی پانچویں رپوٹ میں سوائے اس کے کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں کہ عہدنامۂ جدید اور انجیل کے مختلف حصّوں کی طلب اور اشاعت بہت بڑھ گئی ہے اور انھیں اُردو، ہندی اور پنجابی میں شایع کیا جا رہا ہے۔ اس رپوٹ کی بنیاد جس خاص مقولے پر ہے وہ سب مجھے

---

[1] ان کی دل چسپ سوانح حیات تاریخ ادب ہندوی و ہندستانی، جلد دوم صفحہ ۱۴۸ سے ملاحظہ فرمائیے۔

بہت پسند ہو:

"انسان کا گوشت گھانس کی طرح ہو اور اس کی خوبیاں ایسی جیسے کھیتوں کے پھول، گھانس سوکھ جاتی ہو، پھول مرجھا جاتے ہیں لیکن ہمارے خدا کا لفظ ہمیشہ باقی رہتا ہو"[1]

راج پوتانہ کے مشن کی گزشتہ سال کی رپوٹ کے بعد اب اس کا علم ہوتا ہو کہ وہاں تیرہ مشنری ہیں جن میں سے تین طب کے ماہر ہیں۔ وہاں انھوں نے بہتر مدارس کھولے ہیں جن میں بارہ ہزار بیالیس لڑکے اور لڑکیاں پڑھ رہی ہیں اور اڑتیس آدمی اب تک عیسائی بن چکے ہیں[2]

رومن کیتھولک فرقے کا ایک خوب صورت کلیسا آگرہ میں جو اکبرِ اعظم کا پایۂ تخت رہ چکا ہو، پہلے ہی سے موجود ہو، اب حال ہی میں ایک اور خوب صورت سا کلیسا جبل پور میں بنایا گیا ہو جس میں عورتوں کے لیے بھی ایک حصہ ہو۔ ایک اور عظیم الشان گرجا الہ آباد میں جو صوبۂ شمال مغربی کا پایۂ تخت ہو، بنایا گیا ہو[3]

ہمیں چاہیے کہ ان نیک مشنریوں کی ہمت بڑھائیں اور ان سے کہیں "اے معزز گروہ چلو وہاں جہاں خدا کی شوکت اور دنیا کی نجات تمھیں آنے کی دعوت دے رہی ہو" —— "تمام مخلوق میں اعلان کردو کہ قوموں کے دیوتا خراب اصل کے ہیں"

---

[1] اسایا باب ۴۰ آیت ۶ و ۸

[2] اخبار انجمن پنجاب ۱۸ مارچ ۱۸۷۳ء

[3] 'ON PREACHING TO THE HINDUS' کے عنوان سے شایع ہوا ہو۔

خود کو اپنے فرائض پر آمادہ کرنے کے لیے مشنریوں کو چاہیے کہ اسقف ہیبر Heber کے مقدس بھجن کے یہ الفاظ اپنے آپ سے دُہرا کر کہیں :-

"ہم وہ ہیں کہ ہماری رُوحیں بلندی کی عقل و فراست سے روشن ہو چکی ہیں۔ بھلا کیا ہم تاریکی میں گرفتار آدمیوں کو زندگی کا چراغ دکھانے سے دریغ کریں"۔

مشنریوں کے ایک جلسے میں جو الہ آباد میں ۲۴ نومبر ۱۸۶۲ء کو ہوا بمبئی کے ریورنڈ جے. و لسن Rev. J. Wilson نے ایک یادداشت ہندوؤں میں تبلیغ کے طریقے پر پڑھی۔ ریورنڈ آر۔ سی۔ ماتھر (REV. R. C. MATHER) اور جگدیش نے بھی اسی موضوع پر روشنی ڈالی۔ ریورنڈ عماد الدین نے مسلمانوں میں تبلیغ کے طریقوں پر ایک تقریر کی اور ریورنڈ ڈاکٹر مرے مچل Rev. Dr. Murray Mitchel نے بھی اسی مبحث پر گفتگو کی اور خصوصیت سے مسلمانانِ بنگال کے مسئلے پر۔[1]

کرسچین ورنی کیولر سوسائٹی آف انڈیا Christian Vernacular Society of India قائم شدہ ۱۸۵۸ء کا پانچواں جلسہ گزشتہ مہینے پُرجوش انگلیکن کاونٹ شافٹس بری (Shaftsbury) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریورنڈ جے۔ ایچ۔ ٹتھکومب (REV. J. H. TITHCOMB) نے اپنی رپوٹ میں ذکر کیا کہ سوسائٹی نے معلّمین کی تین درس گاہیں قائم کی تھیں جن سے دو سو مدرّس فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں جو مختلف مدارس کے صدر ہوں گے جن میں سات ہزار

[1] علی گڑھ اخبار ۳۰ جنوری ۱۸۶۳ء و انڈین میل ۲۷ جنوری ۱۸۶۳ء

بچے پڑھ رہے ہیں اور سوسائٹی کی کوششوں سے ہندستانی اور ہند کی دوسری زبانوں میں انجیل کے چار ملین نسخے تقسیم کیے جا چکے ہیں
اسقفِ اعظم یارک اور لارڈ لارنس Lord Lawrence کی تقریروں کے بعد ڈاکٹر مرے مچل نے جو حال ہی میں ہندستان سے وارد ہوئے ہیں، چشم دید شہادت کے طور پر یہ بیان کیا کہ اس سوسائٹی سے ہندستان کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس کے مدرسے انتہائی بہتر طور پر کام کر رہے ہیں لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ رُوحانی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے مقابلے میں سوسائٹی کی تمام تر خدمات ایسی ہیں جیسے پانی کے ٹب میں ایک قطرہ[۱]۔

بہت سی مشنری خواتین بھی ہیں جو ڈاکٹری تعلیم حاصل کر رہی ہیں تاکہ اس طرح انھیں زنانے میں جانے کا موقع ملے اور بہ وقت واحد ارواح و اجسام کا علاج کر سکیں۔ بمبئی میں اور خصوصیت سے شمالی ہند میں ان کی کام یابی مشاہدے میں آ چکی ہے[۱]۔

اس سال (۱۸۷۳ء) اسقفِ کلکتہ نے پنجاب کا سفر کیا۔ لاہور میں انھوں نے پینتیس ہندستانیوں کو عیسائی کیا جن میں سے چار یوریشین تھے۔ اثنائے قیام میں سینٹ جین کے مذہبی کالج میں جس کے ناظم ریورنڈ ٹی۔ وی فرنچ Rev. T. V. French ہیں اور جہاں ہندستانی اُردو میں تعلیم دی جاتی ہے، اسقف

---

[۱] ~~انڈین میل ۱۹ فروری ۱۸۷۳ء~~

[۲] Colonial Church Chronicle. شمارۂ جون ۱۸۷۳ء